U101842 16-12

Title - SEERATUL-NU'MAAN

Creator - Shibli Nemani

Publisher - Fine Art Press (Deoband).

Date - N.A.

Pages - 176.

Subjects - N.A.

بسلسلہ مطبوعات دفتر رسالہ مولوی دہلی

السیرۃ النعمان

یعنی

حالات و واقعات مفصل حضرت امام اعظم

مؤلفہ

علامہ شبلی نعمانی

حصہ اوّل نام و نسب ولادت ۔ سن رشد تعلیم و تربیت ، شیوخ حدیث درس و افتا ۔ ذہانت طباعی اور اسی قسم کے بہت سے حالات ہیں

حصہ دوم امام صاحب کے اصول مسائل سے جو کلام و علم الکلام ۔ فن حدیث ۔ فن تقریر ۔ فن فقہ اور اجتہاد وغیرہ پر تفصیلی معلومات ۔

عطاء الرحمن صدیقی رسالہ مولوی دہلی نے

نسیم فائن آرٹ پریس دیوبند میں طبع کرا کر شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حمد و ستائش کہ بعنوانِ خوش است — نعت ہماں گو نہ ہماں سا خوش است
شیفتگانیم و پیمبر پرست — سجدہ اگر نیست زمیں بوس ہست
تا بخودی پایہ نگہدار باش — دم ز شریعت زن و ہشیار باش
ہر چہ ز بیش است و ز کم باز داں — سجدۂ تعظیم ز ہم باز داں
دیدۂ الفت کہ بود ہیچ ہیچ — پا چو نہی بر تو نہ گیریم ہیچ
من کہ دریں دائرہ از دیر باز — پاسے ز خلوت نہ نہادم فراز
باز برآنم کہ دریں راہ روے — دل برم از خلق بہ افسوں گرے
خواستہ ام طرح دیگر ریختن — شعبدۂ تازہ برانگیختن
بزمِ دگر ہست و تماشا دگر — بادہ دگر آرم و مینا دگر
زمزمۂ تازہ بہ ساز افگنم — غلغلہ در حلقۂ راز افگنم
بادہ فرستم بہ حریفانِ دگر — از مے دوشین قدرے تند تر
زخمہ کہ بر تارِ سخن می زنم — ہاں بنگر تا بچہ فن می زنم
قاعدۂ سحر طرازی ست ایں — نیک نگہ کن کہ چہ بازی ست ایں
پا چو دریں معرکہ افشردہ ایم — پایۂ فن تا بہ سہا بردہ ایم
حرمتِ ایں کار نگہ داشتن — نامہ بہ لعل و گہر انباشتن
کارِ من ست ایں ہمہ ہر خام نیست — ایں بود آں مے کہ بہ ہر جام نیست
دست اگر سوے قدح بردہ ام — جائے عنب لختِ جگر افشردہ ام
کانِ معانی ہمہ کاویدہ ام — ایں گہرے چند فراچیدہ ام
غارتِ بت خانۂ چیں کردہ ام — تا صنمے چند گزیں کردہ ام
خاکِ درِ میکدہ ہا بیختم — ایں مے صافی بہ قدح ریختم
دایہ گر از دگراں خواستم — چارہ نہ زو بود از آں خواستم

فنِ سیر گرچہ بود دلپذیر — نیست درو خود روایت پذیر
گرچہ متاع از دگر آوردہ ام — قطرہ ز بودم گہر آوردہ ام
گرچہ مرا شیوہ این فن نہ بود — حرف بہ اردو زدن آئین نہ بود
پیش ترازِ گرم طلب بودہ ام — بادیہ پیمائے عرب بودہ ام
بزم چوں آں فراواں ساز داشت — ساغرِ من بادۂ شیراز داشت
لیک چوں آں مطرب و ساقی نماند — بوئے ازاں میکدہ باقی نماند
بزم بہ طرزِ دگر آراستم — خوش تر ازاں نیز کہ می خواستم
گرچہ سر و برگ سخن دیگرست — شمع ہماں است لگن دیگرست
بادگوارا بہ عزیزاں تمام — بادۂ گل گوں بہ سفالینہ جام

ناموران اسلام - جس کا ایک حصہ المامون چھپ کر شائع ہو چکا ہے اوّل جب مجھ کو اس کا خیال پیدا ہوا تو نہایت وسیع بنیاد ہوا - جس طرح میں نے خلافت و سلطنت کے مختلف خاندانوں سے ہیرو انتخاب کئے - ارادہ تھا کہ اسی طرح علوم و فنون کے جُدا جُدا خاندان قائم کئے جائیں اور جو لوگ ان خاص خاص فنون میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے ان کو اس سلسلہ کا ہیرو قرار دیا جائے مگر اتنا بڑا کام تنہا میرے بس کا نہ تھا مجبورًا حیثیت حکومت کی قید لگا کر میں نے اس وسیع خیال کو بہت محدود کر دیا بلکہ سلسلہ حکومت سے بھی بہت سے خاندان چھوڑ دیئے - تاہم وہ خیال دل سے نہ گیا کہ فرصت ہو تو اہل کمال کا دربار بھی سجایا جائے کہ اَلسَّیْفُ وَالْقَلَمُ تَوأمان -

المامون کے بعد میں نے الفاروق لکھنی شروع کی تھی اور ایک معتبر حصہ لکھ بھی لیا تھا لیکن بعض مجبوریوں سے چند روز کے لئے اس کی تالیف سے ہاتھ اٹھانا پڑا اس پر کوتاہ بینوں نے عجیب عجیب بدگمانیاں کیں - حالانکہ بات اتنی تھی کہ بعض نادر کتابیں جو اس تصنیف کے لئے نہایت ضروری ہیں اور یورپ میں چھپ رہی ہیں ابھی پوری چھپ کر نہیں آ چکیں - اس زمانہ انتظار میں بیکار بیٹھنا تو مشکل تھا خیال ہوا کہ کسی اور نامور

کی لائف شروع کردوں لیکن یہ دیکھ کر کہ الفاروق ناتمام ہے طبیعت رک جاتی تھی اور اس میدان میں ایک قدم آگے نہ بڑھ سکتا، ادھر یہ خلش چین نہ لینے دیتی تھی کہ علمی نام آوروں کے کارنامے بھی دکھانے ضرور ہیں کیونکہ اسلام میں تیغ و قلم کا ہمیشہ ساتھ رہا ہے۔

آخر یہ خیال غالب آیا اور چند روز کے لئے خاندان حکومت کو چھوڑ کر علمی سلسلہ کی طرف توجہ کرنی پڑی۔ فقہ، حدیث، ادب، منطق، فلسفہ، ریاضی، مختلف خاندان سامنے تھے۔ بعض وجوہ سے فقہ کو ترجیح دی اور امام ابوحنیفہ رح کو جو فقہ کے بانی ہیں اس کا ہیرو قرار دیا۔ امام ابوحنیفہ رح کے اجتہادی مسائل قریباً بارہ سو برس سے تمام ممالکِ اسلام میں پھیلے ہوئے ہیں۔ بڑی بڑی عظیم الشان اسلامی سلطنتوں میں انہی کے مسائل قانونِ سلطنت تھے اور آج بھی ہیں۔ اسلامی دنیا کا غالب حصہ انہی کے مسائل کا پیرو ہے۔ عربی، فارسی، ترکی بلکہ یورپ کی زبانوں میں ان کی متعدد سوانحمریاں لکھی گئیں۔ ظلم تھا اگر ان کی لائف خود اردو میں نہ لکھی جاتی جو بلحاظ انہی کے پیرووں کی زبان ہے۔

امام ابوحنیفہ رح کو اسلام میں جو رتبہ حاصل ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جس کثرت سے ان کی سوانحمریاں لکھی گئیں کسی کی نہیں لکھی گئیں۔ مسلمانوں میں علم رجال کو جو ترقی ہوئی دنیا میں اس کی کوئی نظیر موجود نہیں۔

تراجم، طبقات، قرون، وفیات، اعیان، سنین وغیرہ کے نام سے جدا جدا عنوان قائم ہوئے اور ایک ایک عنوان کے ذیل میں اس کثرت سے کتابیں لکھی گئیں کہ ان کا شمار بھی مشکل ہے۔ لیکن خاص سیرت (لائف) کے فن میں چنداں ترقی نہیں ہوئی علماؤ شعرا و قضاۃ، حکما میں سے بہت کم ایسے خوش قسمت ہیں جنکے حالات مستقل تصنیفوں میں لکھے گئے۔ جہاں تک ہم کو معلوم ہے صرف امام ابوحنیفہ رح ایک شخص ہیں جنکے واقعات زندگی کیساتھ معمول سے زیادہ اعتنا کیا گیا۔ نہایت کثرت کیساتھ انکی سوانحمریاں لکھی گئیں اور ان ناموروں نے لکھیں جو اس قابل تھے کہ انکی مستقل سوانحمریاں لکھی جائیں۔ اس خصوصیت میں اگر کوئی شخص امام ابوحنیفہ رح کا ہمسر ہے تو وہ صرف امام شافعی رح ہیں۔ امام ابوحنیفہ رح کے حالات میں جسقدر کتابیں لکھی گئیں ان میں سے جسقدر ہم تحقیق کر سکے حسب ذیل ہیں:-

نام کتاب[1]	نام مصنف	کیفیت
عقود المرجان	امام احمد بن محمد طحاوی المتوفی سنہ ۳۲۱ ہجری	امام طحاوی حدیث و فقہ کے مشہور امام اور صرف ایک واسطہ سے امام شافعی رح کے شاگرد ہیں۔ ان کی تصنیفات میں معانی الآثار چھپ گئی ہے۔ یہ عقود المرجان کا خلاصہ ہے۔
قلائد عقود الدرر العقیان	امام احمد بن محمد طحاوی	یہ عقود المرجان کا خلاصہ ہے
الروضۃ العالیۃ المنیفہ	امام محمد بن احمد بن شعیب۔ المتوفی سنہ [illegible] ہجری	امام محمد بن احمد۔ حدیث میں حاکم کے اُستاد ہیں۔ یہ کتاب اس جلدوں میں ہے۔ (الجواہر المضیئہ ترجمہ محمد بن احمد)
مناقب النعمان	شیخ ابو عبداللہ الضمیری حسن بن علی	قاضی ضمیری بڑے فقیہ اور فن حدیث میں دارقطنی کے شاگرد تھے۔ مورخ خطیب نے ان سے روایت کی ہے۔ قاضی ابوالولید باجی نے ان کو امام الحنفیہ کہا ہے۔ سنہ ۴۳۶ھ میں وفات پائی۔ یہ تصنیف ایک ضخیم کتاب ہے اور امام ابوحنیفہ رح کے متعلق تصانیف کا زیادہ تر ماخذ یہی کتاب ہے (الجواہر المضیئہ)
مناقب النعمان	ابو العباس احمد بن الصلت الحمانی المتوفی سنہ [illegible] ہجری	نہایت مفصل کتاب ہے صاحب کشف الظنون نے لکھا ہے کہ خطیب بغدادی نے ابو العباس کی تصنیف کی ہے جیسا کہ حنفیوں کی نسبت انکی عام عادت ہے۔

[1] یہ فہرست زیادہ تر کشف الظنون سے ماخوذ ہے۔ بعض کتابوں کے نام یا مصنفین اور سب کے نا تمام حالات اور کتابوں سے لئے گئے ہیں وہاں خاص تصریح کر دی گئی ہے۔ ۱۲

نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
شقائق النعمان فی مناقب النعمان	علامہ جار اللہ زمخشری المتوفی ۵۳۸ھ	زمخشری ایک نامور مصنف ہیں۔ تفسیر کشاف ان کی مشہور کتاب ہے۔
مناقب النعمان	موفق الدین بن احمد المالکی الخوارزمی۔ المتوفی ۵۶۸ھ	یہ کتاب چالیس بابوں میں ہے موفق الدین علامہ زمخشری کے شاگرد فقہ و ادب میں کامل تھے۔ حافظ سیوطی نے بغیۃ الوعاۃ میں ان کا ذکر کیا ہے۔
کشف الآثار	امام عبداللہ بن محمد الحارثی۔	مشہور مصنف ہیں۔ ابن جوزی نے ابوسعید سے روایت کی ہے کہ حدیث میں ان کا اعتبار نہیں۔ اس پر صاحب جواہر المضیہ فرماتے ہیں کہ امام عبداللہ کا رتبہ ابن جوزی و ابوسعید دونوں سے بڑھ کر ہے۔
مناقب النعمان	امام ظہیر الدین المرغینانی المتوفی ۵۰۶ ہجری	مشہور فقیہ ہیں۔ جواہر المضیہ کے مصنف نے لکھا ہے کہ قاضی خاں انہی کے شاگرد تھے
مناقب النعمان	امام محمد بن محمد الکردری المتوفی ۸۲۸ھ	گیارہ بابوں میں ہے اسمیں امام کے حالات کیساتھ ان کے مشہور تلامذہ یعنی قاضی ابو یوسف رح امام محمد رح عبداللہ بن المبارک رح امام زفر رح داؤد الطائی رح وکیع بن الجراح رح حفص بن غیاث یحییٰ بن زکریا رح حسن بن زیاد کے حالات بھی جدا جدا بابوں میں لکھے ہیں۔ یہ کتاب روم میں بہت متداول ہے سلطان مراد ثانی کے حکم سے محمد بن عمر نے ترکی زبان میں اس کا ترجمہ کیا۔

نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
مناقب النعمان کتاب الانتقاء فی مناقب الثلاثۃ الفقہاء	ابوالقاسم بن کاسس قاضی بن عبد البر المتوفی سنہ ۴۶۳ ہجری	عقود الجمان میں اس کتاب کے اکثر حوالے ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ و امام مالکؒ و امام شافعیؒ کے حالات ہیں۔ علامہ ابن خلکان نے قاضی ابویوسفؒ کے ترجمہ میں اس کتاب کا ذکر کیا ہے۔ قاضی ابن عبدالبر بہت بڑے محدث اور امام ہیں۔ انکی کتاب صحابہ کے حالات میں ایک مشہور اور مستند کتاب ہے
مناقب النعمان	ابوالقاسم عبداللہ بن محمد احمد المعروف بابن ابی العوام	
مناقب ابی حنیفہ	علامہ ذہبی	علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ میں نے امام ابوحنیفہؒ کے مناقب ایک جداگانہ رسالہ میں لکھے ہیں علامہ ذہبی بہت بڑے محدث تھے۔ اس فن میں اُن کے بعد کوئی اس رتبہ کا نہیں ہوا۔
المواہب الشریفہ بستان فی مناقب النعمان	شیخ محی الدین عبدالقادر القرشی المتوفی ۷۷۵ھ	انکی مشہور کتابیں ہیں (اسکا ترجمہ ہوگیا ہے جسکا نام تحفۃ السلطان فی مناقب النعمان ہے) الجواہر المضیۃ فی طبقات الحنفیہ انہی کی تالیف ہے۔ حدیث میں حافظ تقی الدین سبکی کے شاگرد ہیں۔
تبییض الصحیفہ فی مناقب ابی حنیفہ	حافظ جلال الدین سیوطیؒ	مشہور مصنف ہیں۔
عقود الجمان فی مناقب النعمان	محمد یوسف بن علی الدمشقی	زیادہ تفصیل آگے آئے گی۔

نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
الخیرات الحسان فی مناقب النعمان	حافظ ابن حجر مکی مصنف صواعق محرقہ	مشہور مصنف ہیں۔
قلائد عقود العقیان فی مناقب النعمان	شمس الدین احمد بن محمد السیواسی	مؤلف کا نام معلوم نہیں دیباچہ سے معلوم ہوا کہ یمن کا کوئی عالم ہے۔ ترکی میں بزاد ترجمہ
مناقب الامام الاعظم	شیخ ابو سعید	فارسی زبان میں ہے
رسالہ فی فضل ابی حنیفہ	عتیق بن داؤد الیمانی	
نظم الجمان	شیخ صارم الدین ابراہیم ابن محمد بن دقماق المتوفی سنہ ۱۲۶ھ	تین جلدوں میں ہے۔ امام ابوحنیفہ رح قاضی ابویوسف رح و امام محمد رح ہر ایک کے حال میں الگ الگ جلد ہے۔
مناقب الامام الاعظم	مولانا محمد کافی آفندی قاضی بغداد المتوفی سنہ ۱۱۲۶ھ	ترکی میں ہے۔
مناقب الامام الاعظم	مستقیم زادہ سلیمان سعد الدین آفندی	ضخیم کتاب ہے سنہ ۱۱۶۱ھ میں تالیف ہوئی ترکی زبان ہے۔

افسوس ہے کہ یہ کتابیں ہمارے ملک میں ناپید ہیں۔ میرے پاس عقود الجمان، الخیرات الحسان موجود ہیں اور قلائد العقیان کا ایک عتیق نسخہ نظر سے گزرا ہے۔ الخیرات الحسان اگرچہ اس وجہ سے کہ ابن حجر مکی کی طرف منسوب ہے زیادہ مشہور ہے لیکن وہ خود کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے بلکہ تمام تر عقود الجمان کا خلاصہ ہے اور خود مصنف نے دیباچۂ کتاب میں اس کا اعتراف کیا ہے۔ قلائد العقیان کے دیباچہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ زیادہ تر قاضی ضمیری کی تصنیف سے ماخوذ ہے۔ عقود الجمان جو نہایت جامع اور مفصل کتاب ہے اور میری تالیف کا تمام ماخذ وہی ہے۔ حافظ ابوالمحاسن محمد یوسف بن علی الدمشقی الصالحی نزیل برقوقیہ کی تصنیف ہے۔ حافظ ابوالمحاسن جلال الدین سیوطی کے شاگرد اور فن حدیث میں ممتاز ہیں۔ یہ کتاب جیسا کہ خود مصنف نے خاتمہ میں تصریح کی ہے ربیع الثانی سنہ ۹۳۹ ہجری میں

تمام ہوئی۔ دیباچہ میں لکھا ہے کہ میں نے امام ابوحنیفہ رح کے حالات میں بہت سی کتابیں دیکھی ہیں جن میں سے موافق بن احمد خوارزمی کی تصنیف سب سے عمدہ تر اور جامع ہے۔ کتاب کے خاتمہ لکھا ہے کہ میں نے اس بحث میں جسقدر کتابیں دیکھیں اگر ان سے لکھنا چاہتا تو یہ کتاب دو ضخیم جلدوں میں تیار ہوتی۔

امام ابوحنیفہ رح کے حالات میں تصنیف تو مجھ کو یہی مل سکی لیکن رجال و تاریخ کی مستند کتابیں جن میں امام کا ذکر ہے اکثر میری نظر سے گذریں جن میں تاریخ صغیر بخاری، معارف ابن قتیبہ، مختصر تاریخ خطیب بغدادی، انساب سمعانی، تہذیب الاسماء فی اللغات للنووی، تذکرۃ الحفاظ علامہ ذہبی، دول الاسلام للذہبی، عبر فی اخبار من غبر للذہبی، تہذیب التہذیب حافظ ابن حجر عسقلانی، خلاصہ تذہیب تہذیب الکمال للعلامہ صفی الدین الخزرجی خاصۃً قابلِ ذکر ہیں۔ کیونکہ یہ وہ کتابیں ہیں جن پر آج فن رجال کا مدار ہے اور حدیثوں کی تنقید کیلئے زیادہ تر انہیں تصنیفات کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔

میری کتاب کا پہلا حصّہ جسمیں امام ابوحنیفہ رح کے عام حالات ہیں انہی تصنیفات سے ماخوذ ہے۔ لیکن دوسرا حصّہ جسمیں امام صاحب کے طرز اجتہاد و اصول استنباط سے بحث ہے اس کیلئے یہ دفتر بیکار تھا۔ کیونکہ قدیم زمانہ میں سوانح عمریوں کا یہ ڈھنگ ہی نہ تھا کہ حالات زندگی کے ساتھ اس شخص کی تصنیفات یا مسائل سے بھی بحث کرتے۔ مناظرہ اور مذہبی حمایت کے پیرایہ میں۔ البتہ ایسی کتابیں لکھی گئی ہیں کہ ان سے مسائل اور تصنیفات پر تفصیلی ریویو لکھا جا سکتا ہے۔

مثلاً ابن ابی شیبہ نے امام ابوحنیفہ رح کے مسائل پر جو اعتراضات کئے اور ثابت کیا کہ وہ حدیث کے مخالف ہیں، قاسم بن قطلوبغا المتوفی ۸۷۹ھ نے اس کا مفصل جواب لکھا۔ شمس الائمہ کردری نے منخول کے جواب میں ایک مستقل کتاب لکھی۔ اسی طرح ترجیح مذہب ابی حنیفہ کے نام سے شیخ اکمل الدین محمد بن البابرتی المتوفی ۷۸۶ھ اور شیخ ابوعبداللہ محمد بن یحییٰ الجرجانی المتوفی ۳۹۷ھ نے مستقل کتابیں لکھیں۔

مورخ سبط ابن جوزی نے ایک ضخیم کتاب دو جلدوں میں لکھی جسکا نام الانتصار

الامام وائمۃ الانتصار ہے۔ اسی مورخ کی ایک اور تصنیف ہے جو تیس بابوں میں ہے اسمیں تفصیلاً امام ابوحنیفہؒ کے مسائل کی عمدگی ثابت کی ہے۔ صاحب کشف الظنون نے لکھا ہے کہ یہ کتاب اپنے باب میں بے نظیر ہے۔ اسی مضمون پر عمر بن محمد سید الموصلی کی ایک تصنیف ہے جس کا نام الانتصار والترجیح ہے۔ سب سے مفصل کتاب الابانہ ہے جو قاضی ابوجعفر احمد بن عبداللہ بن القاسم کی تصنیف ہے اور چھ بابوں پر منقسم ہے۔ پہلے باب میں ثابت کیا ہے کہ امام کا مذہب اصول سلطنت سے بہت مناسبت رکھتا ہے، دوسرا باب اس بحث میں ہے کہ اُن کے مسائل حدیث و آثار سے ثابت ہیں۔ چھٹے باب میں اُن مسائل کا ذکر ہے جن پر مخالفوں نے اعتراض کئے ہیں۔ پھر نہایت تفصیل کے ساتھ اُن کے جواب دئے ہیں۔

جواہر المضیئہ کے مصنف نے لکھا ہے کہ میں نے یہ کتاب دیکھی ہے نہایت عمدہ کتاب ہے اور جو دعویٰ کیا ہے اُسکے ثبوت میں بہت سی مثالیں دی ہیں۔

بے شبہ اس قسم کی تصنیفات سے بہت بڑی مدد مل سکتی تھی لیکن مصنف کشف الظنون کی سی قسمت کہاں سے لائں کہ ان نایاب تصنیفات پر دسترس پا سکتا۔ بڑی تلاش سے شمس الائمہ کردری کا رسالہ بہم پہنچا کہ اس ناداری میں وہ بھی غنیمت ہے بعض باتیں اس رسالہ سے لیں۔ باقی میرا تتبع اور تحقیق ہے جسکے کے لئے خوش قسمتی سے حدیث و فقہ کا بڑا ذخیرہ میرے پاس مہیا تھا۔

یہ بات بھی لحاظ رکھنے کے قابل ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کی زندگی کی مختلف حیثیتیں ہیں۔ ولادت، نشو و نما، طریقہ معاش، طرز معاشرت وغیرہ۔ اس قسم کے حالات کو تاریخی پیرایہ کہتے ہیں۔ روایت میں ان کا ثقہ ہونا نہ ہونا محدثانہ بحث ہے، ان کے مسائل و طریقہ اجتہاد پر رائے قائم کرنی مجتہد کا کام ہے۔ اس لئے جو کتاب ان تمام حیثیتوں پر شامل ہوگی ضرور ہے کہ مختلف بحثوں میں اسکی حیثیتیں بھی بدلتی جائیں، اس کا طرز تحریر کہیں مورخانہ ہوگا اور کہیں محدثانہ اور دونوں پہلوؤں سے الگ مجتہدانہ روش ہوگی اس کتاب میں میں نے ان مختلف حیثیتوں کا لحاظ رکھا ہے، جو حالات تاریخ سے متعلق ہیں ان

ہیں وہ شہادتیں کافی سمجھی ہیں جو عام مورخوں کے نزدیک مسلم ہیں۔ جو واقعہ محدثانہ پہلو رکھتا ہے اس میں زیادہ تر تحقیق کی ہے اور تمامتر ان اصولوں سے کام لیا ہے جو محدثین نے اخبار و روایت کے لئے قرار دئے ہیں۔ عام ناظرین کو شاید ان بحثوں میں مزہ نہ آئے مگر ایسے ضروری کو حصہ کو میں کیونکر چھوڑ سکتا تھا۔ عام تاریخی واقعات میں گو روداۃ حدیث کی طرح بال کی کھال نکالی ہے تاہم کوئی ایسا واقعہ نہیں لکھا جس کی سند موجود نہ ہو۔ ساتھ ہی اس کا التزام کیا ہے کہ ایسی کتاب کا حوالہ نہ دیا جائے جو خود میری نظر سے نہ گذری ہو۔ کیونکہ نقل در نقل ہو کر اکثر روایتیں اپنی حالت پر قائم نہیں رہتیں۔ ان احتیاطوں کے ساتھ بھی ممکن بلکہ ضروری ہے کہ مجھ سے مسامحات اور غلطیاں ہوئی ہوں لیکن میں اس سے زیادہ اور کیا کرسکتا تھا وقال اللہ تعالےٰ۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔

امام ابوحنیفہ رح کا نام ونسب وولادت

نعمانؔ نام۔ ابوحنیفہ کنیت۔ امامؔ لقب۔ شجرۂ نسب یہ ہے:۔ نعمان بن ثابت بن زوطی بن ماہ۔ یہ امر جیسا کہ ناموں کی ترکیب سے ظاہر ہے عموماً مسلم ہے کہ امام صاحب عجمی النسل تھے۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کس نسل تھے اور عرب میں کیونکر آئے؟ خطیب مورخ بغدادی نے امام کے پوتے اسمٰعیل کی زبانی روایت نقل کی ہے کہ میں حماد بن ثابت بن نعمان بن مرزبان ہوں۔ ہم لوگ نسل فارس سے ہیں اور کبھی کسی کی غلامی میں نہیں آئے ہمارے دادا ابوحنیفہ رح ۸۰ھ میں پیدا ہوئے۔ ثابت بچپن میں حضرت علی رض کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ انھوں نے ان کے دادا اور ان کے خاندان کے حق میں دعائے خیر کی تھی۔ ہم کو امید ہے کہ وہ دعا بے اثر نہیں رہی[1]۔ اسمٰعیل نے امام صاحب کے دادا کا نام نعمان بتایا اور پردادا کا نام مرزبان۔ حالانکہ عام طور میں زوطی اور ماہ مشہور ہے غالباً جب زوطی ایمان لائے تو ان کا نام نعمانؔ سے بدل دیا گیا۔ اسمٰعیل نے سلسلہ نسب کے

[1] مختصر تاریخ بغداد لابن جزلہ ترجمہ امام ابوحنیفہ رح ۱۲

بیان میں زوطی کا دینی اسلامی نام لیا اور جمعیت اسلام کا مقتضا بھی یہی تھا ۔ زوطی کے باپ کا نام غالباً کچھ اور ہوگا اور ماہ مرزبان لقب ہوں گے کیونکہ اسمٰعیل کی روایت سے اسقدر اور بھی ثابت ہے کہ ان کا خاندان فارس کا ایک معزز اور مشہور خاندان تھا ۔ فارس میں رئیس شہر کو مرزبان کہتے ہیں ۔ اسی لئے نہایت قرین قیاس ہے کہ ماہ اور مرزبان لقب ہیں ۔ امام حافظ ابوالمحاسن نے قیاس لگایا ہے ماہ اور مرزبان ہم معنی الفاظ ہوں گے ۔ انھوں نے قیاساً کہا کیونکہ وہ فارسی زبان نہیں جانتے تھے ۔ لیکن میں یقیناً کہتا ہوں کہ درحقیقت ماہ اور مرزبان کے ایک معنی ہیں ۔ ماہ دراصل وہی مہ ہے جسکے معنی بزرگ اور سردار کے ہیں مشہور مصرع ہے " نہ کہ را منزلت ماند نہ مہ را " عربی لہجہ نے " مہ " کو " ماہ " کر دیا ہے ۔

زوطی غلام نہ تھے

بعض مورخوں نے زوطی کی نسبت لکھا ہے کہ کابل سے گرفتار ہو کر آئے اور قبیلہ بنی تیم اللہ کی ایک عورت نے خریدا ۔ کچھ دنوں غلامی میں رہے پھر اس نے آزاد کر دیا ۔ اسی لئے امام کا خاندان بنی تیم اللہ کہلاتا ہے ۔ مخالفوں نے جن کو امام کی تنقیص میں مزہ آتا ہے اس روایت کو زیادہ چمکایا ہے حالانکہ اس قسم کی غلامی ثابت بھی ہو تو کسرِ شان کی کیا بات ہے ۔ زمانے نے خاندان کسریٰ پر اس کا داغ لگایا ہے ۔ ہمارے علماء حضرات ہاجرہ کو کنیز تسلیم کرتے ہیں (گو توریت سے ثابت نہیں) اسلام کے قریب تر زمانہ میں اکثر وہ لوگ حدیث و روایت کے امام نظر آتے ہیں جن پر اس قسم کی غلامی کا اطلاق ہو چکا تھا ۔ امام حسن بصری، ابن سیرین طاؤس، عطا، یسار، نافع، عکرمہ، مکحول جو اپنے زمانہ کے مقتدائے عام تھے، خود یا انکے باپ دادا غلام رہ چکے تھے ۔ زوطی کا غلام ہونا بھی ثابت ہو تو کچھ عار نہیں لیکن تاریخی شہادتیں اس کے خلاف ہیں ۔ امام کے نسب میں اور بھی اختلافات ہیں ۔ ابومطیع نے ان کو نسل عرب سے شمار کیا ہے اور سلسلۂ نسب یوں بتایا ہے ۔ نعمان بن ثابت بن زوطی بن یحییٰ بن زید بن اسد بن راشد الانصاری ۔ حافظ ابواسحاق نے شجرۂ نسب کے متعلق یہ روایت نقل کی ہے :۔ نعمان بن ثابت بن کاؤس بن ہرمز بن بہرام ۔

زوطی کے مقام سکونت میں بھی اختلاف ہے اور یہ اختلافات ضرور ہونے چاہیئے تھے ۔ زوطی اوّل اوّل جب عرب میں آئے ہوں گے تو برسوں تک انکی حالت بیگانگی کی

حالت رہی ہوگی۔ لوگوں کو ان کے حالات کے ساتھ چنداں اعتنا نہ ہوگا اور ہوگا تو زبان کی اجنبیت کی وجہ سے صحیح حالات نہ معلوم ہو سکے ہوں گے۔ معاشرت کی ضرورتوں نے زوطی کو مجبور کیا ہوگا کہ وہاں کے رہنے والوں سے دوستانہ تعلقات پیدا کریں۔ یہ طریقہ عرب میں عام طور پر جاری تھا اور اس قسم کے تعلق کو ولاء کہتے تھے جس کا مشتق مولی ہے مولی غلام کو بھی کہتے ہیں۔ اسی طرح لفظی مشارکت سے بعضوں نے زوطی کو غلام سمجھ لیا اور رفتہ رفتہ یہ خیال روایت کی شکل پکڑ کر کسی قدر عام ہوگیا جسکی وجہ سے اسمٰعیل کو دفع دخل کرنا پڑا کہ "واللہ ہمارا خاندان کبھی کسی کی غلامی میں نہیں آیا" اسمٰعیل نہایت ثقہ اور معزز شخص تھے اس وجہ سے دقیقہ سنج مورخوں نے اس بحث میں انہی کی روایت پر اعتماد کیا ہے کہ صاحِبُ البَیتِ اَدْریٰ بِمَا فِیْھَا۔ قاضی ضیمری نے جو بڑے پایہ کے مصنف ہیں صاف تصریح کی ہے کہ زوطی بنی تیم اللہ کی حلیف[1] یعنی ہم قسم تھے۔ اس روایت کا (جسمیں زوطی کی غلامی کا ذکر ہے) یہ حصّہ بھی غلط ہے کہ وہ کابل سے گرفتار ہو کر آئے۔ زوطی کے باپ دادا کے نام فارسی زبان کے ہیں۔ خود امام ابوحنیفہؒ کی نسبت ثابت ہے کہ وہ خاندانی حیثیت سے فارسی زبان جانتے تھے۔ یہ ظاہر ہے کہ کابل کی زبان فارسی تھی۔

زوطی کی نسبت ہم نہیں بتا سکتے کہ خاص شہر کے رہنے والے تھے۔ مورخوں نے مختلف شہروں کے نام لئے ہیں جن میں سے کسی کی نسبت ترجیح کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ یقینی طور پر جو ثابت ہے وہ صرف اس قدر کہ اقلیم فارس اور فارسی النسل سے تھے۔ یہ ممالک اس زمانہ میں اسلامی اثر سے معمور اور اکثر بڑے بڑے خاندان اسلام قبول کرتے جاتے تھے۔ غالباً زوطی اسی زمانہ میں ایمان لائے اور جوش شوق یا خاندان والوں کی ناراضی سے جس کا سبب تبدیل مذہب تھا عرب کا رُخ کیا۔ یہ جناب امیر علیہ السلام کی خلافت کا زمانہ تھا اور شہر کوفہ دارالخلافہ ہونے کا شرف رکھتا تھا اس تعلق سے زوطی

---

[1] دیکھیے قلائد عقود العقیان باب اوّل۔ علامہ نووی نے تہذیب الاسماء واللغات کے مقدمہ میں لکھا ہے مولیٰ کا لفظ زیادہ تر حلیف ہی کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔

نے کوفہ کو پسند کیا اور وہیں سکونت اختیار کی۔ کبھی کبھی جناب امیر کے دربار میں حاضر ہوتے اور خلوص عقیدت کے آداب بجالاتے۔ ایک بار نوروز کے دن کہ پارسیوں کی عید کا دن ہے فالودہ نذر کے طور پر بھیجا۔ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ "نوروزنا کل یوم" یعنی ہمارے ہاں ہر روز نوروز ہے۔ ثابتؒ امام ابو حنیفہؒ کے پدر بزرگوار کوفہ ہی میں پیدا ہوئے۔ زوطی نے نیک فال لڑکے کو حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر کیا آپ نے بزرگانہ شفقت فرمائی اور ان کی اولاد کے حق میں دعائے خیر کی۔

ثابت کے حالات زندگی بالکل نامعلوم ہیں۔ قرائن سے اس قدر پتہ چلتا ہے کہ تجارت کے ذریعہ سے زندگی بسر کرتے تھے۔ چالیس برس کی عمر ہوئی تو خدا نے فرزند عطا کیا جسکا نام والدین نے نعمانؒ رکھا۔ لیکن زمانہ نے آگے چل کر امام اعظم کے لقب سے پکارا۔ اسوقت عبد الملک بن مروان جو دولت مروانیہ کا دوسرا تاجدار شمار کیا جاتا ہے مسند آرائے خلافت تھا۔ یہ وہ عہد تھا کہ رسول اللہ صلعم کے جمال مبارک سے جن لوگوں کی آنکھیں روشن ہوئی تھیں ان میں سے چند بزرگ موجود تھے جن میں سے بعض امام ابو حنیفہؒ کے آغاز شباب تک زندہ رہے انسؓ بن مالک نے جو رسول اللہ صلعم کے خاص خادم تھے ۹۳ھ میں وفات پائی۔ سہل بن سعدؓ نے ۹۱ھ میں انتقال کیا اور ابوالطفیل عامر بن واثلہ سو ہجری تک زندہ رہے لیکن یہ ثابت نہیں ہوتا کہ امام ابو حنیفہؒ نے کسی سے بھی کوئی حدیث روایت کی اس پر لوگوں کو نہایت تعجب ہے اور مؤرخوں نے اسکے مختلف اسباب خیال کئے ہیں۔ بعضوں کی رائے ہے کہ امام ابو حنیفہؒ نے اس وقت تک کسی سے تعلیم نہیں حاصل کی تھی۔ انکے باپ دادا تجارت کرتے تھے اسلئے انکی نشو ونما بھی ایک عام تاجر کی حیثیت سے ہوئی بڑے ہونے پر امام شافعیؒ کی ہدایت سے علم کی طرف متوجہ ہوئے۔ اسوقت موقع ہاتھ سے نکل چکا تھا یعنی صحابہ میں سے کوئی باقی نہ رہا تھا۔ لیکن میرے نزدیک اسکی ایک اور وجہ ہے۔ محدثین میں باہم اختلاف ہے کہ حدیث سیکھنے کیلئے کم از کم کیا عمر مشروط ہے۔ اس امر میں ارباب کوفہ سب سے زیادہ احتیاط کرتے تھے یعنی بیس برس سے کم عمر کا شخص حدیث کی درسگاہ میں شامل نہیں ہو سکتا تھا۔ انکے نزدیک چونکہ حدیثیں بالمعنی روایت کی گئی ہیں اسلئے ضرور

لہ مقدمہ ابن الصلاح مطبوعہ لکھنؤ صفحہ ۵۸ ۔

ہے کہ طالب علم پوری عمر کو پہنچ چکا ہو اور نہ مطالب کے سمجھنے اور اسکے ادا کرنے میں غلطی کا احتمال ہے۔ غالباً یہی قید تھی جس نے امام ابوحنیفہ رح کو ایسے بڑے شرف سے محروم رکھا اور سچ پوچھو تو یہ قید مصلحت سے خالی نہیں تھی۔ جن لوگوں نے دس بارہ برس کے سن میں صحابہ سے حدیثیں سنیں انکی روایتیں اس لحاظ سے تو نہایت قابل اعتماد ہیں کہ رسول اللہ تک صرف ایک واسطہ ہے لیکن اس بات کا قوی احتمال موجود ہے کہ کم سنی کی وجہ سے مضمون حدیث کی تمام خصوصیتیں خیال میں نہ آئی ہوں جسکی وجہ سے ادائے مطلب میں عظیم الشان غلطیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ بہر نوع وجہ جو کچھ ہو واقعہ یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ رح نے کسی صحابی سے کوئی حدیث نہیں سُنی تاہم یہ شرف ان کی قسمت تھا کہ جن آنکھوں نے پیغمبر کا جمال دیکھا تھا انکے دیدار سے عقیدت کی آنکھیں روشن کیں۔ یہ واقعہ ایک تاریخی واقعہ ہے لیکن اس سے تابعیت کا رتبہ حاصل ہوتا ہے اسلئے یہ مسئلہ مذہبی پیرایہ میں آ گیا ہے اور اس پر بڑی بحثیں قائم ہو گئی ہیں۔ بے شبہہ امام ابوحنیفہ رح کو اس شرف پر بڑا ناز تھا اور بجا تھا کہ انھوں نے حضرت انس رض کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ غیر قومیں ان باتوں کو معمولی امر خیال کرینگے لیکن ان واقعات سے اس محبت اور جوش عقیدت کا اندازہ ہوتا ہے جو مسلمانو کو رسول اللہ ص اور انکے تعلق کی وجہ سے صحابہ کیساتھ تھا۔ سچ ہے۔ شعر

فی الجملہ نسبتے بہ تو کافی بود مرا — بلبل ہمیں کہ قافیہ گل بود بست

ف تابعیت کی بحث

ہمارے زمانے کے بعض مصنفین نے امام کی تابعیت سے انکار کیا ہے اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے پہلے بھی لوگوں کو شبہہ ہوا تھا لیکن محدثین نے جن کو اس قسم کی جستجو کرنیکا سب سے زیادہ حق حاصل ہے امام کے موافق فیصلہ کیا۔ حافظ ابن حجر عسقلانی سے کہ فن حدیث کے ایک عنصر ہیں فتویٰ لیا گیا؟ انھوں نے یہ جواب لکھا:۔ امام ابوحنیفہ رح کے زمانہ میں کئی صحابی موجود تھے اسلئے کہ امام ۸۰ھ میں بمقام کوفہ پیدا ہوئے اور اس وقت وہاں صحابہ میں سے عبداللہ بن ابی اوفیٰ موجود تھے کیونکہ ۸۱ھ میں یا اس کے بعد مرے۔ اور ابن سعد نے روایت کی ہے جس کی سند میں کچھ نقصان نہیں کہ امام ابوحنیفہ نے انس رض بن مالک کو دیکھا تھا۔ ان دو صحابہ کے سوا اور اصحاب بھی

ف حافظ ابن حجر کا فتویٰ

مختلف شہروں میں موجود تھے بعض لوگوں نے ان حدیثوں کو جمع کیا ہے جو امام نے صحابہ سے روایت کیں لیکن ان حدیثوں کی سندیں ضعف سے خالی نہیں اور صحیح یہی ہے کہ امام ان کے ہمعصر تھے اور بعض صحابہ کو دیکھا تھا جیسا کہ ابن سعد نے روایت کی ہے۔ پس اس لحاظ سے امام ابوحنیفہؒ تابعین کے طبقہ میں ہیں اور اماموں کی نسبت جو اُن ہمعصر تھے اوزاعی شام میں۔ حمادؒ بصرہ میں، ثوری کوفہ میں، مالک مدینہ شریف میں۔ لیثؒ مصر میں ثابت نہیں ہوا۔ واللہ اعلم۔

ابن سعد کی جس روایت کا حافظ ابن حجر نے حوالہ دیا ہے وہ صرف ایک واسطہ یعنی سیف بن جابر کے ذریعہ سے امام ابوحنیفہ تک پہنچتی ہے۔ یعنی ابن سعد نے جابر سے سُنا اور سیف خود امام ابوحنیفہؒ سے۔ ابن سعد وہ شخص ہیں جن کی نسبت علامہ نووی نے تہذیب الاسماء میں لکھا ہے کہ اگرچہ ان کا شیخ واقدی ثقہ نہیں مگر وہ خود نہایت ثقہ ہیں۔ سیف بن جابر بصرہ کے قاضی اور صحیح الروایۃ تھے۔ اس لحاظ سے یہ روایت اس قدر صحیح اور مستند ہے کہ قوی سے قوی حدیث بھی اس سے زیادہ صحیح نہیں ہو سکتی۔

اس بنا پر تمام بڑے بڑے محدثین مثلاً خطیب بغدادی، علامہ سمعانی مصنف کتاب الانساب، علامہ نووی شارح صحیح مسلم، علامہ ذہبی، حافظ ابن حجر عسقلانی، زین الدین عراقی، سخاوی ابوالمحاسن دمشقی نے جن پر اب حدیث و روایت کا مدار ہے قطعاً فیصلہ کر دیا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے حضرت انسؓ کو دیکھا تھا۔

ابن خلکان نے بھی خطیب بغدادی کا یہ قول نقل کیا ہے۔ لیکن چونکہ مورخ مذکور نے لکھا ہے کہ "امام ابوحنیفہؒ کو کسی صحابی سے ملاقات اور روایت حاصل نہیں ہوئی لوگوں کو دھوکہ ہوا کہ ابن خلکان تابعیت کے منکر ہیں۔ حالانکہ ابن خلکان کو ملاقات اور روایت سے انکار ہے نہ رویت سے۔ لیکن اگر ابن خلکان کی عبارت کا وہی مطلب ہو جو بعض ظاہر بینوں نے قرار دیا ہے تاہم کون کہہ سکتا ہے کہ ایسے بڑے بڑے محدثین کے مقابلہ میں ان کی شہادت کچھ بھی قابل اعتبار ہو گی۔ اصول روایت سے یہ مسئلہ طے ہو چکا ہے کہ اگر کسی واقعہ کے اثبات و نفی میں برابر

لہ اس فتوے کو حافظ ابوالمحاسن نے عقود الجمان میں (جیسا تھا) نقل کیا ہے اور میں نے اسی کا لفظی ترجمہ کیا ہے۔

کے درجہ کی شہادتیں موجود ہوں تو اثبات کا اعتبار ہوگا۔ یہاں نفی کی شہادت ثبوت کے مقابلہ میں بالکل کم رتبہ ہے۔

بعض حنفیوں نے رویت سے بڑھ کر روایت کا بھی دعویٰ کیا ہے اور تعجب ہے کہ علامہ عینی شارح ہدایہ بھی اسی غلطی کے حامی ہیں لیکن انصاف یہ ہے کہ دعویٰ ہرگز پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتا حالانکہ ابوالمحاسن نے عقود الجمان میں ان تمام حدیثوں کو مع سند نقل کیا ہے جن کی نسبت یہ خیال ہے کہ امام نے صحابہ سے سنی تھیں پھر اصول حدیث سے ان کی جانچ کی ہے اور ثابت کر دیا ہے کہ ہرگز ثابت نہیں[1]۔ محدثانہ بحثیں تو دقت طلب ہیں صاف بات یہ ہے کہ امام نے صحابہ سے ایک بھی روایت کی ہوتی تو سب سے پہلے امام کے تلامذۂ خاص اسکو شہرت دیتے لیکن قاضی ابو یوسف، امام محمد، حافظ عبدالرزاق، ابن ہمام، عبداللہ بن المبارک، ابونعیم، فضل بن دکین، مکی بن ابراہیم، ابوعاصم النبیل وغیرہ سے کہ امام کے مشہور اور با اخلاص شاگرد تھے اور سچ پوچھئے تو زیادہ تر انہیں لوگوں نے ان کی نام آوری کے سکے بٹھائے ہیں، ایک حرف بھی اس واقعہ کے متعلق منقول نہیں۔

امام کی کنیت جو نام سے زیادہ مشہور ہے حقیقی کنیت نہیں ہے امام کی کسی اولاد کا نام حنیفہ نہ تھا۔ یہ کنیت وصفی معنی کے اعتبار سے ہے۔ ابوالملۃ الحنیفہ قرآن مجید میں خدا نے مسلمانوں سے خطاب کرکے کہا ہے وَاتَّبِعُوا مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا۔ امام ابوحنیفہ رح نے اسی نسبت سے اپنی کنیت ابوحنیفہ رح رکھی ہے[2]

سن رشد، تعلیم و تربیت، شیوخ و اساتذہ

امام کے بچپن کا زمانہ نہایت پُر آشوب زمانہ تھا۔ حجاج بن یوسف خلیفہ عبدالملک کی طرف سے عراق کا گورنر تھا اور ہر طرف ایک قیامت برپا تھی کیونکہ مذہبی گروہ کی مخالفت کی وجہ سے عرب و عراق میں ابتک مروانی حکومت کے پاؤں نہیں جمے تھے حجاج کی سفاکیاں

---

[1] تذکرۃ الحفاظ میں علامہ ذہبی نے یہ تشریح موجود ہے۔ [2] مختصر تاریخ بغدادی کتاب الانساب وتہذیب الاسماء واللغات و تذکرۃ الحفاظ وغیرہ فی الاخبار من غبر الذہبی وتہذیب التہذیب میں امام ابوحنیفہ کا ترجمہ دیکھو۔

انھیں لوگوں پر مبذول تھیں جو آئمہ مذہب اور علم و فضل کی حیثیت سے مقتدائے عام تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے نہایت سچ کہا ہے اگر اور پیغمبروں کی امتیں سب مل کر اپنے اپنے زمانہ کے بدکاروں کو پیش کریں اور ہم صرف حجاج کو پیش کریں تو واللہ ہمارا ہی پلہ بھاری رہے گا۔ عبدالملک نے ۸۶ھ میں وفات پائی اور اس کا بیٹا ولید تخت نشین ہوا۔ ولید کے زمانے میں اگرچہ فتوحات نے نہایت ترقی کی۔ اسپین و سندھ دو بڑی مملکتیں اسلام کے قبضہ میں آگئیں۔ سمرقند خوارزم سے گذر کر کابل و فرغانہ پر علم اسلام نصب ہوا۔ مغرب کی طرف سے جزائر منورقہ و میورقہ فتح ہوئے، لیکن اسلام کی روحانی برکتوں کا نشان نہ تھا ملکی عہدہ داروں میں سے جو لوگ جسقدر زیادہ معزز اور با اختیار تھے اسی قدر ظالم و سفاک تھے۔ اسی زمانہ کی نسبت سے حضرت عمر بن عبدالعزیز فرمایا کرتے تھے کہ "ولید شام میں، حجاج عراق میں، عثمان حجاز میں قرہ مصر میں واللہ تمام دنیا ظلم سے بھر گئی"۔ اسی عالمگیر آشوب میں بھی اگرچہ درس و تعلیم کا سلسلہ بند نہیں ہوا، جابجا حدیث و روایت کی درسگاہیں موجود تھیں اور فقہاء و محدثین باوجود بے اطمینانی کے درس و تدریس میں مشغول تھے تاہم اسلام حوصلہ مندیوں اور جوش کے لحاظ جس قدر رکھتا نہایت کم تھا۔

ملک خوش قسمتی تھی کہ حجاج ۹۵ھ میں مرگیا۔ ولید نے بھی ۹۶ھ میں وفات پائی۔ ولید کے بعد سلیمان بن عبدالملک نے مسند خلافت کو زینت دی جسکی نسبت مورخین کا بیان ہے کہ خلفاء بنو امیہ میں سب سے افضل تھا۔ سلیمان نے اسلامی دنیا پر سب سے بڑا احسان یہ کیا کہ عمر بن عبدالعزیز کو مشیر سلطنت بنایا اور مرتے دم تحریری وصیت کی کہ "میرے بعد عمر بن عبدالعزیز تخت نشین ہوں"۔ سلیمان نے ۹۹ھ میں وفات پائی اور وصیت کے موافق عمر بن عبدالعزیز مسند خلافت پر بیٹھے۔ ان کی خلافت نے دفعتاً حکومت مروانی کا رنگ بدل دیا اور تمام ملک میں عدل و انصاف، علم و عمل، خیر و برکت کی جان تازہ ڈالدی۔ ایک مدت سے جو حضرت علیؓ پر خطبوں میں جو لعن طعن پڑھا جاتا تھا یک لخت موقوف کر دیا۔ شہزادگان بنی امیہ کے ہاتھ سے جاگیریں چھین لیں، جہاں جہاں ظالم عمال تھے یک قلم معزول کر دیئے۔ سب سے بڑھکر یہ کہ علوم مذہبی کو وہ رونق دی کہ گھر گھر انہی کے چرچے پھیل گئے۔ امام زہری کو حکم دیا کہ حدیثوں کو یکجا کریں چنانچہ

تیار ہوا تو ممالک اسلامیہ میں اسکی نقلیں بھجوائیں - غرض حجاج اور ولید کے عہد تک تو امام ابوحنیفہ رح کو تحصیل علوم کی طرف متوجہ ہونیکی رغبت ہوسکتی تھی نہ موقعہ مل سکتا تھا، تجارت باپ دادا کی میراث تھی اسلئے خزبانی کا کارخانہ قائم کیا اور حسن تدبیر سے اسکو بہت کچھ ترقی دی، لیکن سلیمان کے عہد خلافت میں جب درس وتدریس کے چرچے زیادہ عام ہوئے تو ان کے دل میں بھی ایک تحریک پیدا ہوئی۔ حسن اتفاق یہ کہ انہی دنوں میں ایک اتفاقیہ واقعہ پیش آیا جس سے ان کے ارادہ کو اور بھی استحکام ہوا -

تحصیل علمی کی ابتدا

ایک دن بازار جارہے تھے امام شعبی جو کوفہ کے مشہور امام تھے انکا مکان راہ میں تھا سامنے سے نکلے تو انھوں نے یہ سمجھ کر کوئی جوان طالب علم ہے پاس بلالیا اور پوچھا کہ کہاں جارہے ہو ؟ انھوں نے ایک سوداگر کا نام لیا - امام شعبی نے کہا میرا مطلب یہ نہ تھا، تم پڑھتے کس سے ہو - ؟ انھوں نے افسوس کیساتھ جواب دیا کہ کسی سے بھی نہیں - شعبی نے کہا کہ مجھکو تم میں قابلیت کے جوہر نظر آتے ہیں تم علمار کی صحبت میں بیٹھا کرو اس نصیحت نے انکے دل میں گھر کر لیا اور نہایت اہتمام سے تحصیل علوم پر متوجہ ہوئے اسوقت تک علم جن چیز کا نام تھا وہ ادب انساب ایام العرب فقہ حدیث کلام تھا - کلام اگرچہ آجکل کا علم کلام نہ تھا کیونکہ اس عہد تک مسائل پر فلسفہ کا پرتو نہیں پڑا تھا تاہم ان علوم میں دقت نظر بلندی خیال، زور طبع کے لئے اس سے وسیع تر میدان نہ تھا۔ اسلام جب تک عرب کی آبادی میں محدود رہا اس کے مسائل نہایت سادہ اور صاف رہے لیکن فارس ومصر وشام پہنچکر ان میں رنگ آمیزیاں شروع ہوگئیں ان ملکوں میں اگرچہ حکمت وفلسفہ کا وہ زور نہ رہا تھا - تاہم فلسفہ کے بگڑے بگڑائے مسائل عام طور پر لوگوں میں پھیلے ہوئے تھے اور طبیعتیں عموماً باریک بینی اور احتمال آفرینی کی عادی تھیں - قرآن پاک میں خدا کی ذات وصفات میں اُو معاد وغیرہ کے متعلق جو کچھ مذکور ہے عرب نے اس کو اجمالی نگاہ سے دیکھا اور خلوص واعتقاد کیلئے وہی کافی تھا - بخلاف اسکے فارس اور شام میں نہایت دقیق بحثیں پیدا ہوگئیں جو وسعت تمدن اور ترقی خیالات کے لحاظ سے ضرور پیدا ہونی چاہیئے تھیں - تنزیہ وتشبیہ صفات، عینیت وغیریت، حدوث وقدم، غرض اس قسم کے بہت مضامین نکل آئے جن کو بحث وتدقیق کی وسعت نے مستقل فن بنادیا رفتہ رفتہ اعتقادی

مسائل میں بھی موشگافیاں شروع ہوگئیں اور راویوں کے اختلافات سے مختلف فرقے بنتے گئے جو قدری، مرجی، معتزلی، جہمی، خارجی، رافضی کہلائے۔ یہ فتنہ یہاں تک بڑھا کہ اہل حق جواب تک ان بحثوں سے الگ تھے انکو بھی مخالفت کی ضرورت سے اس طرف متوجہ ہونا پڑا۔ اس طرح علم کلام پیدا ہوگیا جسکو تدوین ترتیب کی وسعت نے اس رتبہ کو پہنچایا کہ بڑے بڑے آئمہ مذہب نے (مثلاً امام اشعری و ابوالمنصور ماتریدی) کا مایۂ ناز ٹھہرا۔ علم کلام زمانہ مابعد اگرچہ مدوّن و مرتب ہو کر اکتسابی علوم میں داخل ہوگیا لیکن اس وقت تک اس کی تحصیل کیلئے صرف قدرتی ذہانت اور مذہبی معلومات درکار تھیں، قدرت نے امام ابوحنیفہ رح میں یہ تمام باتیں جمع کردی تھیں، رگوں میں ایرانی خون اور طبیعت میں زور و جدت تھی، مذہبی روایتیں اور مسائل کوفہ میں ایسے عام تھے کہ ایک معمولی شخص بھی تعلیم یافتہ لوگوں میں بیٹھ اٹھ کر حاصل کرسکتا تھا۔ امام ابوحنیفہ رح نے اس فن میں وہ کمال پیدا کیا کہ بڑے بڑے اساتذۂ فن بحث کرنے میں ان سے جی چراتے تھے۔ تجارت کی غرض سے اکثر بصرہ جانا ہوتا تھا جو ان تمام فرقوں کا دنگل اور خاص کر خارجیوں کا مرکز تھا۔ اباضیہ، صفریہ، حشویہ وغیرہ سے اکثر بحثیں کیں اور ہمیشہ غالب رہے۔ آخر ان جھگڑوں کو چھوڑ کر وہ علم فقہ پر مائل ہوئے اور تمام عمر اسکی نذر کردی لیکن اخیر تک یہ مذاق طبیعت سے نہ گیا۔ خارجیوں وغیرہ سے ان کے مناظرے علم کلام کی جان ہیں۔ انکی علمی زندگی کے تذکرے میں ہم بعض واقعات کی تفصیل بیان کرینگے۔

شروع شروع میں تو امام صاحب رح اس فن کے بہت دلدادہ رہے لیکن جسقدر عمر اور تجربہ بڑھتا جاتا تھا انکی طبیعت رکتی جاتی تھی۔ خود ان کا بیان ہے کہ آغاز عمر میں اس علم کو سب سے افضل جانتا تھا کیونکہ مجھکو یقین تھا کہ عقیدہ مذہب کی بنیاد انہی باتوں پر ہے لیکن پھر خیال آیا کہ صحابہ کبار ان بحثوں سے ہمیشہ الگ رہے حالانکہ ان باتوں کی حقیقت ان سے زیادہ کون سمجھ سکتا تھا۔ ان کی توجہ جسقدر تھی فقہی مسائل پر تھی اور یہی مسائل وہ دوسروں کو تعلیم دیتے تھے ساتھ ہی خیال گذرا کہ جو لوگ علم کلام میں مصروف ہیں ان کا طرز عمل کیا ہے اس خیال سے اور بھی بیدلی پیدا ہوگئی کیونکہ ان لوگوں میں وہ اخلاقی پاکیزگی اور روحانی اوصاف نہ تھے جو اگلے بزرگوں کا طغرائے امتیاز تھا۔ اسی زمانہ میں ایک دن ایک عورت نے

سلے عقود الجمان باب سادس۔

آکر مسئلہ پوچھا کہ ایک شخص اپنی بیوی کو سنت کے طریقہ پر طلاق دینی چاہتا ہے کیونکر دے؟ خود تو نہ بتا سکے عورت کو ہدایت کی کہ امام حمادؒ جن کا حلقہ درس یہاں سے قریب ہے جا کر پوچھئے۔ یہ بھی کہہ دیا کہ حماد جو کچھ بتائیں مجھ سے کہتی جانا۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس آئی اور کہا کہ حماد نے یہ جواب دیا مجھ کو سخت عبرت ہوئی۔ اسی وقت اٹھ کھڑا ہوا اور حماد کے حلقہ درس میں جا بیٹھا۔ امام کی ابتدائی تحصیل کے متعلق ایک اور روایت ہے جس کا سلسلہ سند خطیب نے امام تک پہنچایا ہے یعنی امام صاحب کا بیان ہے کہ جب میں نے تحصیل علم پر توجہ کی تو بہت سے علوم پیش نظر تھے اور میں متردد تھا کہ کس کو اختیار کروں؟ سب سے پہلے کلام کا خیال آیا۔ ساتھ ہی دل میں گذرا کہ وہ کہ دن کا برآوردن ہے۔ ایک مدت کی محنت و دردسری کے بعد کمال بھی پیدا کیا تو علانیہ اظہار نہیں کر سکتے کہ لوگ الحاد کی تہمت نہ لگائیں۔ ادب اور قرأت کا بجز اسکے کہ مکتب پڑھائیں اور کچھ فائدہ نہ تھا۔ شعر و شعری میں ہجو اور جھوٹی مداح کے سوا اور کیا دھرا تھا۔ حدیث کیلئے اولاً تو ایک مدت درکار تھی اور اس کے علاوہ کمسنوں سے واسطہ پڑتا اور ہر وقت یہ فکر رہتی کہ لوگ جرح و تعدیل کا نشانہ نہ بن جائیں۔ آخر فقہ پر نظر پڑی اور دنیا و دین کی حاجتیں اس سے وابستہ نظر آئیں۔ لیکن روایت محض غلط ہے۔ تمام معتبر روایتیں اسکے خلاف ہیں۔ جو ریمارک امام صاحب کی طرف منسوب کئے ہیں ایسے جاہلانہ ریمارک ہیں کہ ایک معمولی آدمی کی طرف بھی نسبت نہیں کی جا سکتی۔ اس روایت کو صحیح مانیں تو ماننا پڑیگا کہ فقہ و کلام کی طرف امام نے توجہ ہی نہیں کی۔ حالانکہ ان فنون میں امام کا جو پایہ ہے اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ تحصیل علوم کے بعد امام نے خیال کیا ہو کہ کس فن کو اپنا خاص فن بنائیں اور چونکہ عام خلائق کی ضرورتیں فقہ سے وابستہ تھیں اس کو ترجیح دی۔ یہی بات طرز بیان کی رنگ آمیزیوں سے اس حد تک پہنچ گئی۔ جس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ روایت باایں ہمہ کتابت میں آچکی تھی۔ عقود الجمان کے مصنف نے نقل کی تو بہت سے اختلاف پیدا ہو گئے۔ ابن جزلہ نے تاریخ بغداد کا جو اختصار کیا ہے ہمارے پیش نظر ہے۔ اسمیں اس روایت کا جہاں ذکر ہے ہر علم کے متعلق جو ریمارک ہیں دوسروں

ف حماد کی شاگردی

کی طرف منسوب ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ کی نسبت صرف انکا تسلیم کرنا بیان کیا ہے۔

حماد کوفہ کے مشہور امام اور استاد وقت تھے۔ حضرت انسؓ سے جو رسول اللہؐ کے خادم تھے حدیث سنی تھی اور بڑے بڑے تابعین کی فیض صحبت سے مستفید ہوتے تھے اسوقت کوفہ میں انہیں کا مدرسہ مرجع عام سمجھا جاتا تھا شعبہ نے جو آئمہ فن خیال کئے گئے انہی کے حلقہ درس میں تعلیم پائی تھی۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ (صحابی) سے جو فقہ کا سلسلہ چلا آتا تھا اس کا مدار انہیں پر رہ گیا تھا۔ ان باتوں کے ساتھ زمانہ نے بھی ان کا ساتھ دیا تھا یعنی دولتمند اور فارغ البال تھے اور اس وجہ سے نہایت اطمینان اور دلجمعی کیساتھ اپنے کام میں مشغول رہتے تھے۔ ان وجوہ سے امام ابوحنیفہؒ نے علم فقہ پڑھنا چاہا تو استادی کیلئے انہی کو انتخاب کیا۔ اس وقت درس کا طریقہ تھا کہ استاد کسی خاص مسئلہ پر زبانی گفتگو کرتا تھا جسکو شاگرد یاد کر لیتے اور کبھی لکھ بھی لیا کرتے تھے۔ امام ابوحنیفہؒ پہلے دن بائیں صف میں بیٹھے کیونکہ مبتدیوں کیلئے یہ امتیاز عموماً قائم رکھا جاتا تھا۔ لیکن چند روز کے بعد جب حماد کو تجربہ ہو گیا کہ تمام حلقہ میں ایک شخص بھی حافظہ اور ذہانت میں ان کا ہمسر نہیں تو حکم دیدیا کہ ابوحنیفہؒ سب سے آگے بیٹھیں۔

امام نے اگرچہ اسی زمانہ میں حدیث پڑھنی شروع کر دی تھی جسکا تفصیلی بیان آگے آتا ہے تاہم حماد کے حلقہ درس میں ہمیشہ حاضر ہوتے رہے۔ خود ان کا بیان ہے کہ میں دس برس تک حماد کے حلقہ درس میں حاضر ہوتے رہے پھر خیال ہوا کہ اب خود درس و تعلیم کا سلسلہ قائم کروں لیکن استاد کا ادب مانع ہوتا تھا۔ اتفاق سے انہیں دنوں حماد کا ایک رشتہ دار جو بصرہ میں رہا کرتا تھا حماد کے سوا اس کا اور کوئی وارث نہ تھا۔ اس ضرورت سے ان کو بصرہ جانا پڑا۔ چونکہ مجھ کو اپنا جانشین کر گئے تھے تلامذہ اور ارباب حاجت نے میری طرف رجوع کیا۔ بہت سے ایسے مسئلے پیش آئے جنمیں استاد سے میں نے کوئی روایت نہیں سنی تھی اس لئے اپنے اجتہاد سے جواب دیئے اور احتیاط کیلئے ایک یادداشت لکھتا گیا۔ دو مہینے کے بعد حماد بصرہ سے واپس آئے میں نے وہ یادداشت پیش کی کل ساٹھ مسئلے تھے۔ ان میں سے بیس میں غلطیاں نکالیں باقی نسبت فرمایا کہ تمہارے جواب صحیح

ہیں۔ میں نے عہد کیا کہ جب تک حماد زندہ ہیں انکی شاگردی کا تعلق کبھی نہ چھوڑونگا۔ حماد نے سنہ ۱۲۰ھ میں انتقال کیا۔ امام ابو حنیفہؒ نے اگرچہ حماد کے سوا اور بزرگوں کی خدمت میں بھی فقہ کی تحصیل کی لیکن کچھ شبہ نہیں کہ اس فن خاص میں وہ حماد ہی کے تربیت یافتہ ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ حد سے زیادہ ان کی تعظیم کرتے تھے۔

حدیث کی تحصیل

حماد کے زمانہ میں ہی امام نے حدیث کی طرف توجہ کی کیونکہ مسائل فقہ کی مجتہدانہ تحقیق جو امام کو مطلوب تھی حدیث کی تکمیل کے بغیر ممکن نہ تھی۔ اسوقت تمام ممالک اسلامیہ میں بڑے زور شور سے حدیث کا درس جاری تھا اور ہر جگہ سند اور روایت کے دفتر کھلے ہوئے تھے۔ صحابہ جنکی تعداد کم از کم دس ہزار ہے تمام ممالک میں پہنچ گئے تھے اور انکی وجہ سے اسناد و روایت کا ایک عظیم الشان سلسلہ قائم ہو گیا تھا۔ لوگ جہاں کسی صحابی کا نام سنتے تھے ہر طرف سے لوٹ پڑتے تھے کہ چل کر رسول اللہؐ کے حالات سنیں یا مسائل شرعیہ کی تحقیق کریں۔ اس طرح تابعین کا جو صحابہ کے شاگرد کہلاتے تھے بیشمار گروہ پیدا ہو گیا تھا جنکے سلسلے تمام ممالکِ اسلامیہ میں پھیل گئے تھے۔

جن شہروں میں صحابہ یا تابعین کا زیادہ مجمع تھا وہ دار العلوم کے لقب سے زیادہ ممتاز تھے ان میں مکہ معظمہ، مدینہ منورہ میں بصرہ کوفہ کو خاص امتیاز تھا کیونکہ اسلامی آثار کے لحاظ سے کوئی شہر ان مقامات کا ہمسر نہ تھا۔ کوفہ جو امام ابو حنیفہؒ کا مولد مسکن تھا اسلام کی وسعت و تمدن کا گویا دیباچہ تھا۔ اہل عرب کی روز افزوں ترقی کیلئے عرب کی مختصر آبادی کافی نہ تھی، اس ضرورت سے حضرت عمرؓ نے سعد بن ابی وقاص کو جو اسوقت حکومت کسریٰ کا خاتمہ کر کے مدائن میں اقامت گزیں تھے خط لکھا کہ مسلمانوں کیلئے ایک شہر بساؤ جو ان کا دار الہجرت اور قرار گاہ ہو۔ سعدؓ نے کوفہ کی زمین پسند کی سنہ ۱۷ھ میں اس کی بنیاد کا پتھر رکھا گیا اور معمولی سادہ وضع کی عمارتیں تیار ہوئیں اسی وقت عرب کے قبائل ہر طرف سے آ آکر آباد ہونے شروع ہوئے یہاں تک کہ تھوڑے دنوں میں وہ عرب کا ایک خطہ بن گیا۔ حضرت عمرؓ نے یمن کے بارہ ہزار اور نزار کے آٹھ ہزار آدمیوں کیلئے جو وہاں جا کر آباد ہوئے تھے روزینے مقرر کر دیئے۔ چند روز میں جمعیت کے اعتبار سے کوفہ نے وہ حالت پیدا کی کہ جناب فاروقؓ کوفہ کو "رمح اللہ کنزالایمان، جمجمۃ العرب" یعنی خدا کا علم، ایمان کا خزانہ، عرب کا سر فرمایا کرتے تھے اور

خط لکھتے تو اس عنوان سے لکھتے "الی رأس الاسلام، راس العرب" حضرت علیؓ نے اس شہر کو دارالخلافہ قرار دیا۔ صحابہ میں سے ایک ہزار پچاس شخص جنمیں سے چوبیس وہ بزرگ تھے جو غزوۂ بدر میں رسول اللہؐ کے ہمرکاب رہے تھے وہاں گئے۔ بہتوں نے سکونت اختیار کر لی۔ ان بزرگوں کی بدولت ہر طرف حدیث و روایت کے چرچے پھیل گئے تھے اور کوفہ کا ایک ایک گھر حدیث و روایت کا درس گاہ بن گیا تھا[1]

بصرہ بھی اسی مقدس خلیفہ کے حکم سے آباد ہوا تھا اور وسعت علم اور اشاعت حدیث کے اعتبار سے کوفہ کا ہمسر تھا۔ یہ دونوں شہر مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی طرح علوم اسلامی کے دارالعلوم خیال کئے جاتے تھے۔ علامہ ذہبی نے اسلام کے دوسرے تیسرے دور میں جن لوگوں کو حاملین حدیث کا لقب دیا ہے اور انکے مستقل ترجمے لکھے ہیں ان میں اکثر مثلاً مشرق الاجدع، علیہ بن عمرؓ۔ اسود بن زیادؒ۔ ابوعمرالنخعیؒ وذر بن حبیش۔ ربیع بن خثیمؒ۔ عبدالرحمٰن ابن ابی لیلیٰؒ۔ عبدالرحمٰن السلمیؒ۔ شریح بن الحرثؒ۔ شریح بن ہانیؒ ابووائلؒ۔ شفیق بن سلمہؒ۔ قیس بن ابی حازمؒ۔ محمد بن سیرینؒ، حسن بصریؒ۔ شعبہ بن حجاج قتادہ بن دعامہ۔ انہی شہروں کے رہنے والے یا خوش باش تھے۔ سفیان بن عیینہ جو ائمہ حدیث میں شمار کئے جاتے ہیں اکثر فرمایا کرتے تھے کہ مناسک کیلئے مکہ، قرآت کیلئے مدینہ اور حلال و حرام یعنی فقہ کیلئے کوفہ ہے[2]۔ فقہ میں امام نے زیادہ حماد کا حلقۂ درس کافی سمجھا تھا۔ لیکن حدیث میں یہ قناعت ممکن نہ تھی، صرف اجتہاد اور ذہانت سے کام نہ چل سکتا تھا بلکہ روایت کیساتھ روایت کی بھی ضرورت تھی۔ حدیثیں اسوقت نہایت پریشان اور غیر مرتب تھیں یہانتک کہ بڑے بڑے اساتذہ دو چار سو حدیثوں سے زیادہ یاد نہیں رکھتے تھے۔ یہ تعداد ضروری مسائل کیلئے بھی کافی نہ تھی۔ اسکے علاوہ طرق روایت میں اسقدر اختلاف پیدا ہو گئے تھے کہ ایک حدیث جبتک متعدد طریقوں سے نہ معلوم ہو اسکے مفہوم و تعبیر کا ٹھیک ٹھیک متعین ہونا دشوار تھا۔ امام ابوحنیفہؒ کو حماد کی صحبت اور پختگی عمر نے ان ضرورتوں سے

[1] یہ تمام تفصیل فتوح البلدان بلاذری ذکر آثار کوفہ و معجم البلدان و فتح المغیث صفحہ ۳۸۲ میں مذکور ہے [2] تذکرۃ الحفاظ علامہ ذہبی [3] معجم البلدان ذکر کوفہ۔

اچھی طرح واقف کر دیا تھا اس لئے نہایت سعی و اطمینان سے حدیثوں کے بہم پہنچانے پر توجہ کی — تقریباً کوفہ میں کوئی ایسا محدث باقی نہ تھا جسکے سامنے امام نے زانوئے شاگردی طے نہ کیا ہو۔ اور حدیثیں نہ سیکھی ہوں۔ ابو المحاسن شافعی نے جہاں ان کے شیوخ حدیث کے نام گنائے ہیں ترانوے شخصوں کی نسبت لکھا ہے کہ کوفہ کے رہنے والے تھے تزیل تھے تہذیب التہذیب، تہذیب الاسماء و تذکرۃ الحفاظ وغیرہ میں اگرچہ (جیسا کہ ان کتابوں کا عام طریقہ ہے) امام کے شیوخ کا استقصار نہیں کیا ہے تاہم انہی کتابوں کی تبلیغ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ایک گروہ کثیر سے روایت کی جن میں ۲۹ شخص خاص کوفہ کے رہنے والے تھے اور

امام کے شیوخ محدثین

ان میں اکثر تابعی تھے۔ شیوخ کوفہ میں خاص کر امام شعبی، سلمہ بن کہیل، محارب بن وثار، ابو اسحٰق سبیعی، عون بن عبداللہ، سماک بن حرب، عمر بن مرہ، منصور بن المعتمر، اعمش، ابراہیم بن محمد، عدی بن ثابت الانصاری، عطاء بن السائب، موسیٰ بن ابی عائشہ، علقمہ بن مرثد، بہت بڑے محدث اور سند روایت کے مرجع عام تھے۔ سفیان ثوری اور امام حنبل وغیرہ کا سلسلہ سند اکثر انہیں بزرگوں تک پہنچتا ہے۔

امام شعبی رح وہی بزرگ ہیں جنھوں نے امام ابوحنیفہ کو اول اول تحصیل علم کی رغبت دلائی تھی، بہت سے صحابہؓ سے حدیثیں روایت کی تھیں، مشہور ہے کہ پانسو صحابہؓ کو دیکھا تھا۔ عراق، عرب، شام میں چار شخص جو استاد کامل تسلیم کئے جاتے تھے ان میں ایک یہ تھے۔ امام زہری کہا کرتے تھے کہ عالم صرف چار ہیں "مدینہ میں ابن المسیب، بصرہ میں حسن، شام میں مکحول، کوفہ میں شعبی۔" حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ان کو ایک بار مغازی درس دیتے دیکھا تو فرمایا "واللہ یہ شخص اس فن کو مجھ سے اچھا جانتا ہے۔" ایک مدت تک منصب قضا پر مامور رہے۔ خلفاء اور اعیانِ دولت ان کا نہایت احترام کرتے تھے سنہ ۱۰۴ھ میں وفات پائی۔

سلمہ بن کہیل - مشہور محدث اور تابعی تھے۔ جندب بن عبداللہ بن ابی اوفیٰ ابو الطفیل اور انکے علاوہ اور بہت سے صحابہ سے حدیثیں روایت کیں۔ ابن سعد نے ان کو کثیر الحدیث لکھا ہے۔ سفیان بن عیینہ رح امام شافعی رح کے استاد

فرماتے تھے کہ سلمہ بن کہیل ایک رکن ہیں ارکان میں سے۔ ابن مہدی کا قول ہے کہ کوفہ میں چار شخص سب سے زیادہ صحیح الروایۃ تھے۔ منصور، سلمہ، عمرو بن مرہ، ابوحصین۔

ابواسحٰق سبیعی رح ۔ کبار تابعین سے تھے۔ عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن عمرؓ، ابن زبیرؓ، نعمان بن بشیرؓ، زید بن ارقمؓ اور بہت سے صحابہ جن کے نام علامہ نووی نے تہذیب الاسماء میں بالتفصیل لکھے ہیں حدیثیں سنی تھیں۔ عجلی نے لکھا ہے کہ ۳۸ صحابہ سے ان کو بالمشافہہ روایت ہے۔ علی بن المدینی جو امام بخاری کے استاد تھے اُن کا قول ہے کہ ابواسحٰق کے شیوخ حدیث میں نے شمار کیے تو کم و بیش تین سو ٹھہرے۔ حافظ ابن حجر نے تہذیب میں ان کا مفصل لکھا ہے۔

سماک بن حرب رح ۔ بہت بڑے تابعی اور محدث تھے۔ امام سفیان ثوری نے لکھا ہے کہ سماک نے کبھی حدیث میں غلطی نہیں کی۔ خود سماک کا بیان ہے کہ میں اسّی صحابہ سے ملا ہوں۔

محارب بن دثار نے عبداللہ بن عمرؓ اور جابرؓ وغیرہ سے روایت کی۔ امام سفیان ثوری کہا کرتے تھے کہ میں نے کسی کو زاہد نہیں دیکھا جسکو محارب پر ترجیح دوں۔ علامہ ذہبی نے لکھا ہے کہ محارب عموماً حجت ہیں۔ امام احمد، ابن معین، ابوذرعہ، دارقطنی، ابوحاتم، یعقوب بن سفیان، نسائی نے انکو ثقہ تسلیم کیا ہے۔ کوفہ میں منصب قضا پر مامور تھے۔ سنہ ۱۱۶ھ میں وفات پائی۔

عون بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود ۔ حضرت ابوہریرہؓ اور عبداللہ بن عمرؓ سے حدیثیں روایت کیں۔ نہایت ثقہ اور پرہیزگار تھے۔

ہشام بن عروہ رض ۔ معزز و مشہور تابعی تھے۔ بہت سے صحابہ حدیثیں روایت کیں۔ بڑے بڑے ائمہ حدیث مثلاً سفیان ثوری، امام مالک، سفیان بن عیینہ انکے شاگرد تھے۔ ابوجعفر منصور کے زمانے میں کوفہ گئے۔ اہل کوفہ نے اسی زمانہ میں اُن سے حدیثیں روایت کیں۔ خلیفہ منصور ان کا نہایت احترام کرتا تھا۔ ایک بار لاکھ درہم ان کو عطا کیے۔ ان کے جنازہ کی نماز بھی منصور نے ہی پڑھائی تھی۔ ابن سعد

نے لکھا ہے کہ ثقہ اور کثیر الحدیث تھے۔ ابو حاتم نے ان کو امام حدیث لکھا ہے۔

سلیمان بن مہران معروف بہ اعمش - کوفہ کے مشہور امام تھے۔ صحابہ میں سے انس بن مالکؓ سے ملے تھے اور عبداللہ بن ابی اوفیٰ سے حدیث سنی تھی۔ سفیان ثوری و شعبہ ان کے شاگرد تھے۔ امام کی تحصیل حدیث کا دوسرا مدرسہ بصرہ تھا جو امام حسن بصری شعبہ و قتادہ کے فیض تعلیم سے مالامال تھا تعجب ہے کہ حسن بصری باوجودیکہ سنہ ۱۱۰ھ تک زندہ رہے، لیکن امام ابو حنیفہ رح کا ان کے درس سے مستفید ہونا ثابت نہیں ہوتا، البتہ قتادہ کی شاگردی کا ذکر عام محدثین نے کیا ہے اور عقود الجمان کے مختلف مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ امام نے شعبہ سے حدیث روایت کی اور انہوں نے اپنے سامنے ہی فتویٰ و روایت کی اجازت بھی دیدی تھی۔

قتادہ بہت بڑے محدث اور تابعی تھے۔ حضرت انس بن مالکؓ و عبداللہ بن سرجس و ابوالطفیل اور دیگر صحابہ سے حدیثیں روایت کیں۔ حضرت انسؓ کے دو شاگرد جو نہایت نامور ہیں انمیں ایک یہ ہیں۔ اس خصوصیت میں انکو نہایت شہرت تھی کہ حدیث کو بعینہٖ ادا کرتے تھے۔ یعنی الفاظ و معنی میں بالکل فرق نہیں ہوتا تھا۔ انکے قوت حافظہ کی ایک عجیب مثال لکھی ہے۔ عمرو بن عبداللہ کا بیان ہے کہ یہ مدینہ میں سعید ابن المسیب سے فقہ و حدیث پڑھتے تھے۔ ایک دن انھوں نے فرمایا کہ تم ہر روز بہت سی باتیں پوچھتے ہو تم کو ان میں سے کچھ یاد بھی ہیں؟ انھوں نے کہا ایک ایک حرف محفوظ ہے۔ چنانچہ جسقدر ان سے سنا تھا بتقید تاریخ اور دن کے بیان کرنا شروع کیا۔ وہ نہایت متعجب ہوئے اور کہا "خدا نے دنیا میں تم جیسے لوگ بھی پیدا کئے ہیں"۔ اسی بنا پر لوگ انکو احفظ الناس کہا کرتے تھے۔ امام حنبلؒ نے انکی فقہ و واقفیت اختلافات تفسیر دانی کی نہایت مدح کی ہے اور کہا ہے کہ "کوئی شخص ان پانوں میں انکی برابر ہو تو ہو، مگر ان سے بڑھکر نہیں ہو سکتا۔ حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں ان کا حال تفصیل سے لکھا ہے جس سے انکی عظمت و شان کا اندازہ ہو سکتا ہے

شعبہ رح بھی بڑے رتبہ کے محدث تھے۔ دو ہزار حدیثیں یاد تھیں۔ سفیان ثوری نے فن حدیث میں انکو امیر المومنین مانا ہے۔ عراق میں یہ پہلے شخص ہیں جس نے جرح و تعدیل کے مراتب

مقرر کئے۔ امام شافعیؒ فرمایا کرتے تھے کہ شعبہ نہ ہوتے تو عراق میں حدیث کا رواج نہ ہوتا۔ ۱۶۰ھ میں انتقال کیا۔ سفیان ثوری کو انکے مرنے کی خبر پہنچی تو کہا "آج فن حدیث بھی مر گیا"۔ شعبہ کو امام ابو حنیفہ کیساتھ ایک خاص ربط تھا۔ غیبت میں اکثر انکی ذہانت اور خوش فہمی کی تعریف کرتے۔ ایک بار انکا ذکر آیا تو کہا کہ "جسطرح میں جانتا ہوں کہ آفتاب روشن ہے اسی یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ علم اور ابو حنیفہ ہم نشین ہیں"۔ یحیٰی ابن معین سے جو امام بخاری کے استاد تھے کسی نے پوچھا کہ آپ ابو حنیفہؒ کی نسبت کیا خیال رکھتے ہیں۔؟ فرمایا اس قدر کافی ہے شعبہ نے ان کو حدیث و روایت کی اجازت دی اور شعبہ آخر شعبہ ہی ہیں۔ بصرہ کے اور شیوخ جن سے امام ابو حنیفہؒ نے حدیثیں روایت کیں ان میں عبدالکریم بن امیہ اور عاصم بن سلیمان الاحول زیادہ ممتاز ہیں۔

امام ابو حنیفہؒ کو اگرچہ ان درسگاہوں سے بہت بڑا ذخیرہ ہاتھ آیا تاہم تکمیل کی سند حاصل کرنے کیلئے حرمین جانا ضروری تھا جو علوم مذہبی کے اصلی مرکز تھے۔ تاریخوں سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ امام کا پہلا سفر کس سنہ میں واقع ہوا تھا۔ تاہم ظن غالب ہے کہ جب انھوں نے حرمین کا سفر کیا تو تحصیل کا آغاز تھا۔ مورخ ابن خلکان نے لکھا ہے کہ وکیع نے خود امام ابو حنیفہؒ سے روایت کی ہے کہ حج میں ایک حجام نے جس میں نے بال منڈوائے تھے کئی باتوں میں مجھ پر گرفت کی میں نے اجرت پوچھی تو بولا "مناسک چکاکے نہیں کئے جاتے"۔ میں چپ ہو کر اصلاح بنوانے لگا۔ اس نے مجھے ٹوکا کہ حج میں چپکا نہیں رہنا چاہئے تکبیر کہے جاؤ"۔ حجامت سے فارغ ہو کر میں گھر چلا تو اس نے کہا پہلے دو رکعت نماز پڑھ لو پھر کہیں جانا۔ میں نے متعجب ہو کر پوچھا یہ مسائل تم نے کہاں سے سیکھے۔؟ بولا عطاء بن ابی رباح کا فیض ہے۔ اس واقعہ سے زیادہ تر یہی قیاس ہو سکتا ہے کہ ابتدائی زمانہ تھا۔

جس زمانہ میں امام ابو حنیفہؒ مکہ معظمہ پہنچے درس و تدریس کا نہایت زور تھا متعدد اساتذہ کی جو فن حدیث میں کمال رکھتے تھے اور اکثر صحابہ کی خدمت سے مستفیض ہوئے تھے الگ الگ درسگاہ قائم تھے۔ ان میں عطاء بن رباح کا حلقہ سب سے زیادہ وسیع اور مستند تھا۔ عطاء بن ابی رباح عطاء مشہور تابعی تھے اکثر صحابہ کی خدمت میں رہے تھے اور انکے فیض صحبت سے اجتہاد کا

---

[1] عقود الجمان باب دہم۔

درجہ حاصل کیا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عباس، ابن عمر، زبیر، اسامہ بن زید، جابر بن عبداللہ، زید بن ارقم، عبداللہ بن سائب، عقیل، رافع، ابو دردہ، ابو حریرہ اور بہت سے صحابہ سے حدیثیں سنی تھیں۔ خود ان کا بیان ہے کہ "میں دو سو[1] بزرگوں سے ملا ہوں جن کو رسول اللہ کی صحبت کا شرف حاصل ہوا تھا۔" مجتہدین صحابہ انکے علم و فضل کے معترف تھے عبداللہ بن عمر جو حضرت فاروق کے فرزند رشید اور صاحب افتار تھے اکثر فرماتے تھے کہ "عطا بن رباح ہوتے لوگ میرے پاس کیوں آتے ہیں۔" حج کے زمانے میں ہمیشہ سلطنت کی طرف سے منادی مقرر تھا کہ عطا کے سوا کوئی شخص فتوی دینے کا مجاز نہیں ہے[1]۔ بڑے بڑے ائمہ حدیث مثلاً امام اوزاعی، زہری، عمرو بن دینار انھیں کے حلقۂ درس سے نکلکر استاد کہلائے[2]۔

امام ابوحنیفہ رح استفادہ کی غرض سے انکی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے احتیاطاً عقیدہ پوچھا۔ امام نے کہا "میں اسلاف کو برا نہیں کہتا، گنہگار کو کافر نہیں سمجھتا، قضا و قدر کا قائل ہوں" عطا نے اجازت دی کہ حلقۂ درس میں شامل ہوا کریں۔ روز بروز انکی ذہانت طباعی کے جوہر ظاہر ہوتے گئے اور اس کیساتھ استاد کی نظر میں ان کا وقار بھی بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ جب حلقۂ درس میں جاتے تو عطا اوروں کو ہٹا کر ان کو اپنے پہلو میں جگہ دیتے۔ عطا ۱۱۵ھ تک زندہ رہے۔ اس مدت میں امام ابوحنیفہ رح کو جب مکہ معظمہ جانے کا اتفاق ہوتا تو ان کی خدمت میں اکثر حاضر ہوتے اور مستفید ہوتے۔

عطا کے سوا مکہ معظمہ کے اور محدثین جن سے امام نے حدیث کی سند لی ان میں سے عکرمہ کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ عکرمہ حضرت عبداللہ بن عباس کے غلام اور شاگرد تھے۔ انھوں نے نہایت توجہ اور کوشش سے انکی تعلیم و تربیت کی تھی یہاں تک کہ اپنی زندگی میں ہی اجتہاد و فتوی کا مجاز کر دیا تھا۔ عکرمہ نے اور بہت سے صحابہ مثلاً حضرت علی، ابوہریرہ، عبداللہ بن عمر، عقبہ بن عمر، صفوان، جابر، ابو قتادہ سے حدیثیں سیکھی تھیں اور فقہی مسائل تحقیق کیے تھے۔ کم و بیش ستر مشہور تابعین حدیث و تفسیر میں انکے شاگرد ہیں۔ امام شعبی کہا کرتے تھے کہ قرآن جاننے والا عکرمہ سے بڑھکر نہیں رہا۔ سعید بن جبیر کہ

---

[1] تاریخ ابن خلکان ترجمہ عطا بن ابی رباح [2] ابن خلکان اور کتب رجال میں انکے حالات پڑھو۔

تابعین کے سردار تھے ان سے ایک شخص نے پوچھا کہ دنیا میں آپ سے بڑھ کر بھی کوئی عالم ہے؟ فرمایا ہاں عکرمہ رض۔

اس زمانہ میں یعنی ۱۰۳ھ سے پہلے امام ابوحنیفہ نے مدینہ کا قصد کیا کہ حدیث کا مخزن اور نبوت کا آخیر قرار گاہ تھا، صحابہ کے بعد تابعین کے گروہ میں سے سات شخص علم فقہ وحدیث کے مرجع بن گئے تھے اور مسائل شرعیہ میں عموماً انکی طرف رجوع کیا جاتا تھا ان لوگوں نے بڑے بڑے صحابہ کے دامن فیض میں تعلیم پائی تھی اور یہ مرتبہ حاصل کیا تھا کہ تمام ممالک اسلامی میں واسطہ در واسطہ ان کے درس کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ یہ لوگ ہمعصر تھے اور ایک مشترکہ مجلس افتاء کے ذریعہ سے تمام شرعی مسائل کا فیصلہ کرتے تھے مدینہ کی فقہ جسکی تدوین امام مالک رح نے کی اسکی بنیاد زیادہ تر انہی کے فتووں پر ہے۔

فقہائے سبعہ

امام ابوحنیفہ رح جب مدینہ پہنچے تو ان بزرگوں میں سے صرف دو شخص زندہ تھے سلیمان و سالم بن عبداللہ۔ سلیمان حضرت میمونہ رض کے جو رسول اللہ ﷺ کی ازواج مطہرات میں سے تھیں غلام تھے اور فقہائے سبعہ میں فضل و کمال کے لحاظ سے ان کا دوسرا نمبر تھا۔ سالم حضرت فاروق رض کے پوتے تھے اور اپنے والد بزرگوار سے تعلیم پائی تھی۔ امام ابوحنیفہ رح دونوں بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے حدیثیں روایت کیں۔

امام ابوحنیفہ رح کی طالب العلمی کی مسافت اگرچہ مدینہ تک محدود ہے تاہم تعلیم کا سلسلہ اخیر زندگی تک قائم رہا۔ اکثر حرمین جاتے اور مہینوں قیام کرتے حج کی تقریب میں ممالک اسلامی کے ہر گوشہ سے بڑے بڑے اہل کمال مکہ آکر جمع ہوتے تھے جن کا مقصد حج کے ساتھ افادہ و استفادہ بھی ہوتا تھا۔ امام صاحب اکثر ان لوگوں سے ملتے اور مستفید ہوتے۔

امام اوزاعی

امام اوزاعی اور مکحول شامی کہ شام کے امام المذاہب کہلاتے تھے امام ابوحنیفہ رح نے مکہ ہی میں ان سے تعارف حاصل کیا اور حدیث کی سند لی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ امام صاحب کی ذہانت اور اجتہاد کی شہرت دور دور پہنچ گئی تھی یہاں تک ظاہر بینوں نے ان کو قیاس مشہور کر دیا تھا۔ انہی دنوں میں عبداللہ بن مبارک نے جو امام ابوحنیفہ کے مشہور شاگرد ہیں بیروت کا سفر کیا کہ امام اوزاعی سے فن حدیث کی تکمیل کریں۔ پہلی ہی ملاقات میں اوزاعی

نے ان سے پوچھا کہ کوفہ میں امام ابوحنیفہؒ کون شخص پیدا ہوا ہے جو دین میں نئی باتیں نکالتا ہے؟
انھوں نے کچھ جواب نہ دیا اور گھر چلے آئے۔ دو تین دن کے بعد پھر گئے تو کچھ اجزاء ساتھ لیتے گئے۔ اوزاعی نے انکے ہاتھ سے وہ اجزاء لے لئے۔ سرنامہ پر لکھا تھا "قال نعمان بن ثابت" دیر تک غور سے دیکھتے رہے۔ پھر عبداللہ سے پوچھا النعمان کون بزرگ ہیں؟ انھوں نے کہا "عراق کے ایک شیخ ہیں جن کی صحبت میں رہا ہوں" فرمایا بڑے پایہ کا شخص ہے۔ عبداللہ نے عرض کی یہ وہی ابوحنیفہؒ ہیں جنکو مبتدع بتاتے تھے۔ اوزاعی کو اپنی غلطی پر افسوس ہوا۔
حج کی تقریب سے اوزاعی مکہ گئے تو امام ابوحنیفہؒ سے ملاقات ہوئی۔ انہی مسائل کا ذکر آیا۔ اتفاق سے عبداللہ بن المبارک بھی موجود تھے ان کا بیان ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے اس خوبی سے تقریر کی کہ اوزاعی حیران رہ گئے۔ امام ابوحنیفہ کے جانے کے بعد مجھ سے کہا کہ "اس شخص کے کمال نے اس کو لوگوں کا محسود بنا دیا بے شبہہ میری بدگمانی غلط تھی جس کا میں افسوس کرتا ہوں" تاریخوں سے ثابت ہے کہ امام ابوحنیفہ نے فن حدیث میں امام اوزاعی شاگردی کی ہے۔ غالباً یہی زمانہ ہوگا۔

امام باقر علیہ السلام کی شاگردی

حضرت امام باقر علیہ السلام کے ساتھ بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ امام ابوحنیفہؒ دوسری بار مدرسہ گئے تو امام موصوف کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انکے ایک ساتھی نے پہنچوایا کہ یہ امام ابوحنیفہؒ ہیں۔ انہوں نے ابوحنیفہ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ "ہاں تمہیں قیاس کی بنا پر ہمارے دادا کی حدیثوں سے مخالفت کرتے ہو؟ انھوں نے نہایت ادب سے کہا "معاذ اللہ حدیث کی کون مخالفت کرسکتا ہے آپ تشریف رکھیں تو کچھ عرض کروں۔ پھر حسب ذیل گفتگو ہوئی:- (ابوحنیفہ) مرد ضعیف ہے یا عورت؟ (امام باقر) عورت (ابوحنیفہ) وراثت میں مرد کا حصہ زیادہ ہے یا عورت کا؟ (امام باقر) مرد کا (ابوحنیفہ) میں قیاس لگاتا تو کہتا کہ عورت کو زیادہ حصہ دیا جائے کیونکہ ضعیف کو ظاہر قیاس کی بنا پر زیادہ ملنا چاہیئے۔ پھر پوچھا نماز افضل ہے یا روزہ؟ (امام باقر) نماز (ابوحنیفہ) اس اعتبار سے حائضہ عورت پر نماز کی قضا واجب ہونی چاہیئے نہ روزہ کی۔ حالانکہ میں روزہ ہی کی قضا کا فتوی

دیتا ہوں۔ امام باقر اس قدر خوش ہوئے کہ اٹھ کر پیشانی چوم لی[1]۔ ابو حنیفہ رح ایک مدت تک استفادہ کی غرض سے انکی خدمت میں حاضر رہے اور فقہ و حدیث کے متعلق بہت سی نادر باتیں حاصل کیں۔ شیعہ و سنی دونوں نے مانا ہے کہ امام ابوحنیفہ رح کی معلومات کا بڑا ذخیرہ حضرت ممدوح کی فیض صحبت تھا۔" امام صاحب نے انکے فرزند ارشد حضرت امام جعفر صادق رض کی فیض صحبت سے بہت کچھ فائدہ اٹھایا جس کا ذکر عموماً تاریخوں میں پایا جاتا ہے ابن تیمیہ نے اس سے انکار کیا اور اسکی وجہ یہ خیال کی ہے کہ امام ابوحنیفہ رح حضرت جعفر صادق رض کے معاصر ہے اور ہم عصر تھے اسلئے انکی شاگردی کیونکر اختیار کرتے۔ لیکن یہ ابن تیمیہ کی گستاخی اور خیرہ چشمی ہے۔ امام ابو حنیفہ رح لاکھ مجتہد اور فقیہ ہوں لیکن فضل و کمال میں ان کو حضرت جعفر صادق رض سے کیا نسبت ؟ حدیث و فقہ بلکہ تمام مذہبی علوم اہل بیت کے گھر سے نکلے تھے و صاحب البیت ادری بما فیہا۔

یا تو وہ زمانہ تھا کہ امام ابوحنیفہ رح نے ایک طالب علم کی حیثیت سے حرمین کا سفر کیا تھا یا اب وہ نوبت پہنچی کہ سفر کا قصد کرتے تو تمام اطراف میں شہرہ ہو جاتا کہ فقیہ عراق عرب کو جا رہا ہے۔ جس شہر یا گاؤں میں گذر ہوتا تو ہزاروں آدمیوں کا مجمع ہوتا۔ ایک دفعہ مکہ معظمہ گئے تو لوگوں کی وہ کثرت ہوئی کہ مجلس میں تل رکھنے کو جگہ نہ تھی۔ ارباب حدیث و فقہ دونوں فرقے کے لوگ تھے اور شوق کا یہ عالم تھا کہ ایک پر ایک گرا پڑتا تھا۔ آخر امام صاحب نے تنگ آکر فرمایا "کاش ہمارے میزبان سے جا کر کوئی کہتا کہ اس ہجوم کا انتظام کرے" ابو عاصم نبیل حاضر تھے۔ عرض کی کہ میں جاتا ہوں لیکن چند مسئلے دریافت کرنے رہ گئے ہیں۔ امام نے پاس بلا کر زیادہ تر توجہ کے ساتھ انکی باتیں سنیں انہیں میزبان کا خیال جاتا رہا۔ ابو عاصم سے فارغ ہو کر اور طالب العلم کی طرف متوجہ ہوئے اور پھر وہی سلسلہ قائم ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد خیال آیا تو فرمایا کسی شخص نے میزبان کے پاس جانے کا اقرار کیا تھا وہ کہاں گیا ؟ ابو عاصم بولے میں نے عرض کیا تھا۔ فرمایا پھر تم گئے نہیں ؟ ابو عاصم نے ظریفانہ شوخی سے کہا " میں تو یہ نہیں کہا تھا کہ ابھی جاتا ہوں جب فرصت ہو گی جاؤنگا" امام نے فرمایا " عام بول چال میں ان احتمالات کا موقع نہیں۔ ان لفظوں کے معنے ہمیشہ وہی لئے جائینگے جو عوام کی غرض ہوتی ہے"[2] ایک اعتبار سے یہ بھی ایک فقہی مسئلہ تھا

---

[1] عقود الجمان باب شانزدہم [2] الجواہر المضیئہ باب الکنیٰ ترجمہ ابو عاصم النبیل۔

جس کو امام صاحب نے باتوں میں حل کر دیا۔

ف امام صاحب کے اساتذہ ان کی نہایت عزت کرتے تھے

امام صاحب کے اساتذہ اُن کا اسقدر ادب و احترام کرتے تھے کہ لوگوں کو تعجب ہوتا تھا۔ محمد بن الفضل کا بیان ہے کہ ایک دفعہ امام ابوحنیفہؒ ایک حدیث کی تحقیق کیلئے خضیب کے پاس گئے۔ میں بھی انکے ساتھ تھا۔ خضیب نے ان کو آتے دیکھا تو اٹھ کھڑے ہوئے اور نہایت تعظیم کے ساتھ لاکر اپنے برابر بٹھایا۔ امام صاحب نے پوچھا کہ "بیضۂ نعام کے بارہ میں کیا حدیث آئی ہے؟ خضیب نے کہا۔ اخبرنی ابو عبیدۃ عن عبداللہ بن مسعود فی بیض النعام یصیبھا المحرم ان فیہ قیمتہ۔ عمرو بن دینار جو کہ مشہور محدث تھے ابوحنیفہ کے ہوتے ہوئے حلقہ درس میں اور کسی سے خطاب نہیں کرتے تھے۔ اس عظمت کیساتھ امام صاحب کو طلب علم میں کسی سے عار نہ تھی۔ امام مالک عمر میں ان سے تیرہ برس کم تھے انکے حلقہ درس میں بھی اکثر حاضر ہوتے اور حدیثیں سنیں۔ علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ امام مالک کے سامنے ابوحنیفہؒ اسقدر مودب بیٹھتے تھے جسطرح شاگرد استاد کے سامنے بیٹھتا ہے۔ اس کو بعض کوتاہ بینوں نے امام کی کسر شان پر محمول کیا ہے۔ لیکن ہم اس کو علم کی قدر شناسی اور شرافت کا تمغہ سمجھتے ہیں۔ امام مالک بھی ان کا نہایت احترام کرتے تھے عبداللہ بن المبارک کی زبانی منقول ہے کہ میں امام مالک کی خدمت میں حاضر تھا ایک بزرگ آئے جن کی انھوں نے نہایت تعظیم کی اور اپنے برابر بٹھایا۔ ان کے جانے کے بعد فرمایا جانتے ہو یہ کون شخص تھا؟ یہ ابوحنیفہ عراقی تھے جو اس ستون کو سونے کا ثابت کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں" تھوڑی دیر کے بعد اور بزرگ آئے۔ امام مالک نے انکی بھی تعظیم کی۔ لیکن نہ اس قدر جتنی ابوحنیفہؒ کی کی تھی۔ وہ اٹھ گئے تو لوگوں سے کہا یہ سفیان ثوری تھے۔

ف امام کی صحبت

ف حدیث کے مختلف طریقے

حجاز و عراق کے ائمہ فن روایت کے متعلق جدا جدا اصول رکھتے تھے۔ طرز تعلیم بھی مختلف تھا۔ بعضوں کے نزدیک لکھنے کا زیادہ اعتبار تھا۔ جیسے مثلاً ابراہیم، شعبی صرف حافظہ کو سند سمجھتے تھے۔

اکثروں نے اس بات کو جائز رکھا تھا کہ مطلب میں فرق نہ آئے تو روایت میں حدیث کا ایک ٹکڑا چھوڑ دیا جا سکتا ہے۔ بعض اسکے بالکل خلاف تھے۔ ایک فریق کہتا تھا کہ راوی جب تک سامنے

نہ ہو اُس سے روایت نہیں کی جا سکتی۔ شعبہ جو امام صاحب کے استاد تھے انکا یہی مذہب تھا۔ دوسرا گروہ پردہ کی اوٹ سے تحریر کی بنا پر روایت کرنے کو جائز سمجھتا تھا۔ امام زہری عادت تھی کہ روایت کیساتھ الفاظ و مطالب کی تفسیر بھی کرتے جاتے تھے۔ بعض لوگ اس کے سخت مخالف تھے۔ یہاں تک کہ ایک شخص نے خود زہری کو ٹوکا کہ" حدیث نبوی میں آپ اپنے الفاظ نہ ملائیں" امام مالک کو یہ طریقہ زیادہ پسند تھا کہ شاگرد پڑھیں اور وہ سنتے جائیں۔ بعض اسکے مخالف تھے۔ یحییٰ بن سلام اتنی بات پر انکے حلقۂ درس سے ناراض ہو کر اُٹھ آئے کہ" وہ خود نہیں پڑھتے شاگردوں سے پڑھواتے ہیں" اسی طرح اور بہت سے اختلافات تھے جن کو فتح المغیث میں تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کی کثرت شیوخ اور رہزہ چینیوں کا ایک بڑا مقصد یہ تھا کہ ان مختلف اصول سے آگاہ ہوں تاکہ سب کے مقابلہ سے خود ایک مستقل اور جچی ہوئی رائے قائم کر سکیں۔ امام موصوف نے اصول میں جو اصلاحیں کی ہیں اُن کا بیان آگے آئے گا۔

طریقہ تعلیم کی ترقی

امام کی یہ بڑی خوش قسمتی تھی کہ انکی آغاز تحصیل ہی میں حدیث کی تعلیم کا طریقہ مرتب اور باقاعدہ ہو چلا تھا۔ اس سے پہلے عموماً زبانی روایت کا رواج تھا۔ بعض ائمہ حدیث کی کتابت کو ناجائز سمجھتے تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے تقریباً ۱۰۸ھ میں اہل مدینہ کو خط لکھا جس کے الفاظ یہ تھے انظروا ما کان من حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاکتبوہ فانی خشیت دروس العلم وذھاب العلماء یعنی رسول اللہؐ کی جسقدر حدیثیں ہیں قلم بند کر لی جائیں ورنہ ضائع ہونے کا ڈر ہے" اور شہروں میں بھی اس مضمون کے فرامین بھیجے۔ چنانچہ مدینہ میں امام زہری نے ایک مجموعہ مرتب کیا جسکی نقلیں سلطنت کی طرف سے تمام ممالک اسلامی میں شائع ہو گئیں[1]۔ اسوقت سے تدوین علم کا رواج ہو گیا اور جہاں جہاں اہل حدیث تھے اسی طریقے کو برتنے لگے۔ شعبی (امام ابوحنیفہؒ کے استاد) کو اگرچہ زبانی روایت پر اصرار تھا تاہم کتاب ساتھ رکھتے تھے۔ طرز تعلیم نے بھی نہایت ترقی کی۔ شیخ مجمع عام میں ایک بلند مقام پر بیٹھتا اور حدیث کا مجموعہ ہاتھ میں ہوتا، شاگرد قلم

[1] فتح المغیث ۲۲۹ و مقدمہ قسطلانی شرح بخاری مطبوعہ لکھنؤ ۱۲

دوات لیکر بیٹھتا اور استاد جو کچھ روایت کرتا اسی کے الفاظ میں لکھتے جاتے سامعین کی زیادہ کثرت ہوتی تو ایک مستملی کھڑا ہو کر وہ الفاظ دور کے بیٹھنے والوں تک پہنچاتا۔ مگر یہ التزام تھا کہ مطلب بالکل جہاں تک ممکن ہو الفاظ میں فرق نہ آئے۔ اس ضرورت سے مستملی ہمیشہ ایسا شخص مقرر ہوتا تھا جس کا حافظہ قوی اور معلومات وسیع ہوں اور ساتھ ہی خوش لہجہ اور بلند آواز ہو۔ چنانچہ امام شعبہ کی مجلس درس میں آدم بن ابی ایاس اور امام مالک کے حلقہ میں ابن علیہ اس خدمت پر مامور تھے۔

امام ابوحنیفہ اس خصوصیت کیساتھ مشہور ہیں کہ ان کے شیوخ حدیث بیشمار ہیں۔ ابو حفص کبیر نے دعویٰ کیا ہے کہ امام نے کم از کم چار ہزار شخصوں سے حدیثیں روایت کی ہیں۔ اگرچہ تاریخ اسلام میں یہ کوئی عجیب بات نہیں مسلمانوں نے حدیثیں جمع کرنے میں جو محنتیں اور جانفشانیاں کی ہیں دنیا کی اور قومیں اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتیں۔ ہم متعدد شخصوں کے نام بتا سکتے ہیں جن کے شیوخ حدیث چار ہزار سے کم نہ تھے۔ اور ایسے تو بہت سے گزرے ہیں جنکے اساتذہ ہزار سے زیادہ تھے۔ علامہ سخاوی نے فتح المغیث میں ان لوگوں کے نام بھی گنائے ہیں لیکن انصاف یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ کی نسبت یہ دعویٰ محدثانہ اصول پر ثابت نہیں ہو سکتا۔ البتہ اس کا انکار نہیں ہو سکتا کہ امام نے ایک گروہ کثیر سے روایت کی ہے اور اس کا خود محدثین کو اعتراف ہے۔ علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں جہاں اُن شیوخ کے نام گنائے ہیں اخیر میں لکھ دیا ہے "وخلق کثیر" حافظ ابوالمحاسن شافعی نے عقود الجمان میں تین سو انیس شخصوں کے نام بقید نسب لکھے ہیں اور اخیر میں لکھ دیا ہے کہ میں نے ایک دوسری کتاب میں جس کا نام تحصیل السبیل الی معرفۃ الثقات والمجاہیل ہے ان لوگوں کے حالات بھی تفصیل سے لکھے ہیں۔ لیکن چونکہ ان کی فہرست زیادہ تر فقہائے حنفیہ سے ماخوذ ہے ممکن ہے محدثین کو کلیتہً اس سے اتفاق نہ ہو۔

افسوس ہے کہ محدثین نے امام مالک کے حالات میں جو کتابیں لکھی ہیں اور جن میں ان کے شیوخ کا پورا پورا استقصار کیا ہے ہماری نظر سے نہیں گزریں۔ رجال کی مستند کتابیں جن میں امام کا ذکر تا ہمارے سامنے ہیں لیکن ان میں سینکڑوں ہزاروں آدمیوں کے حالات

امام کے شیوخ حدیث بہت تھے

ہیں اس وجہ سے کسی خاص شخص کے متعلق پوری تفصیل نہیں مل سکتی۔ مختصر تاریخ بغداد
تہذیب الکمال، تہذیب الاسماء واللغات، تذکرۃ الحفاظ،
ملخص طبقات الحفاظ، تہذیب التہذیب، انساب سمعانی، مؤطا امام محمد، کتاب
الآثار محمد تتبع[1] سے جسقدر ان کے شیوخ انتخاب ہو سکتے ان کے نام حسب ذیل ہیں۔ اُن
میں سے اکثر کے اجمالی حالات ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔ عطاء بن ابی رباح مکی، عاصم بن ابی
النجود کوفی، علقمہ بن مرثد کوفی، حکم بن عتبہ کوفی، سلمہ بن سہیل کوفی، حضرت امام باقر
مدنی، علی بن الاقمر الکوفی، زیاد بن علاقہ کوفی، سعید بن مسروق کوفی، عدی بن ثابت انصاری
کوفی، عطیہ بن سعد کوفی، ابوحیان سعدی، عبدالکریم بن امیہ بصری، یحییٰ بن سعید مدنی،
ہشام بن عروہ مدنی، (التہذیب) حافظ ابن حجر عسقلانی، ابواسحاق السبیعی کوفی، نافع
بن عمر مدنی، عبدالرحمٰن بن ہرمز الاعرج المدنی، قتادہ بصری، عمرو بن دینار المکی، محارب
بن دثار کوفی، ہیثم بن حبیب الصراف کوفی، قیس بن مسلم کوفی، محمد بن عمر المدنی، یزید
الفقیر کوفی، سماک بن حرب کوفی۔ عبدالعزیز بن رفیع المکی، مکحول شامی، عمر بن مرۃ الکوفی،
ابوالزبیر محمد بن مسلم مکی، عبدالملک بن عمر کوفی، منصور بن زاذان، منصور المعتمر، عطاء
بن السائب الثقفی، عطاء بن ابی المسلم الخراسانی، عاصم بن سلیمان الاحول البصری،
اعمش کوفی، عبداللہ بن عمر بن حفص المدنی، امام اوزاعی (طبقات الحفاظ ذہبی از مقامات
مختلفہ) ابراہیم بن محمد الکوفی، اسمٰعیل بن عبدالملک المکی، حارث بن عبدالرحمٰن المکی،
خالد بن علقمہ الوداعی، ربیعۃ الرائی، شداد بن عبدالرحمٰن بصری، شیبان عبدالرحمٰن مصری
طاؤس بن کیسان یمنی، عبدالرحمٰن بن دینار المدنی، عکرمہ مولی ابن عباس مکی، عون
بن عبداللہ کوفی، قابوس بن ابی ظبیان کوفی، محمد بن سائب الکلبی کوفی، محمد بن مسلم بن
شہاب الزہری، ابوسعید مولی ابن عباس (تہذیب الکمال) موسیٰ بن ابی عائشہ کوفی صلت
بن بہرام، عثمان بن عبداللہ بن حوشب، ہلال، ہیثم بن ابی الہیثم، حصین عبدالرحمٰن،

شیوخ روایت کا شمار

[1] ان کتابوں میں تہذیب الکمال میری نظروں سے نہیں گذری۔ مولوی عبدالحی صاحب مرحوم نے التعلیق
الممجد میں ابوحنیفہؒ کے شیوخ تہذیب الکمال کے حوالہ سے لکھے ہیں تو اسی کے حوالے سے لکھے ہیں۔

معن، میمون بن سیاہ، جواب التیمی، سالم دلافطس، یحییٰ بن عمرو بن سلمہ، عمرو بن جبیر، عبید اللہ بن عمر، محمد بن مالک ہمدانی، ابو السوار، خارجۃ بن عبد اللہ، عبد اللہ بن ابی زیاد، حکم بن زیاد، کثیر الاصم، حمید الاعرج ابو العطوف، عبد اللہ بن الحسن، سلیمان الشیبانی، سعید المرزبان، عثمان بن عبد اللہ ابو حجیہ (کتاب الآثار امام محمد)

ہم نے اس قدر نام سرسری طور سے انتخاب کئے ہیں۔ زیادہ چھان بین کرتے تو شاید عقود الجمان کی فہرست کے برابر اتر تے لیکن سچ یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ کے لئے کثرت شیوخ اس قدر فخر کا باعث نہیں جتنا کہ ان کی تحقیق اور احتیاط ہے۔ وہ اس نکتہ سے خوب واقف تھے کہ روایت میں جسقدر واسطے زیادہ ہوتے ہیں اُسی قدر تغیر و تبدل کا احتمال بڑھتا جاتا ہے۔ یہی بات ہے کہ ان کے اساتذہ اکثر تابعین ہیں جن کو رسول اللہ صلعم تک صرف ایک واسطہ ہے یا وہ لوگ ہیں جو مدت تک بڑے بڑے تابعین کی صحبت میں رہے تھے اور علم و فضل دیانت و پرہیزگاری کے نمونے خیال کئے جاتے تھے۔ ان دو قسموں کے سوا اکثر شاذ ہیں۔ ان کی تعلیم کا طریقہ بھی عام طالب علموں سے الگ تھا۔ بحث و جہاد کی شروع سے عادت تھی اور اس بات میں وہ استادوں کی مخالفت کی کچھ پروا نہ کرتے تھے ایک دفعہ حماد کے ساتھ امام اعمش کی مشایعت کو نکلے، چلتے چلتے مغرب کا وقت آگیا۔ وضو کیلئے پانی کی تلاش ہوئی مگر کہیں نہ مل سکا۔ حماد نے تیمم کا فتویٰ دیا امام نے مخالفت کی۔ اخیر وقت تک انتظار کرنا چاہیئے۔ اتفاق یہ کہ کچھ دور چل کر پانی مل گیا اور سب نے وضو سے نماز ادا کی۔ کہتے ہیں کہ یہ پہلا موقع تھا کہ استاد سے مخالفت کی اور غالباً یہ زمانہ تحصیل کا آغاز تھا۔ (امام شعبی ان کے استاد قائل تھے کہ معصیت میں کفارہ نہیں۔ ایک دفعہ استاد شاگرد کشتی میں سوار تھے۔ اس مسئلہ کا ذکر آیا۔ انھوں نے کہا "ضرور معصیت میں کفارہ ہے کیونکہ خدا نے ظہار میں کفارہ مقرر کیا ہے اور اس آیت میں وَاِنَّهُمْ لَيَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَزُوْرًا تصریح کردی ہے کہ ظہار معصیت ہے۔ امام شعبی کچھ جواب نہ دے سکے۔ خفا ہو کر فرمایا اَقِيَاسِيٌّ اَنْتَ؟ عطاء بن ابی رباح سے کسی نے اس آیت کے معنی پوچھے وَاٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ۔ عطاء نے کہا "خدا نے

حضرت ایوبؑ کی آل و اولاد جو مرگئی تھی زندہ کردی اور ان کے ساتھ اور نئی پیدا کر دی۔"
امام ابوحنیفہؒ نے کہا جو شخص کسی کی صلب سے نہ پیدا ہوا ہو وہ اس کی اولاد کیونکر ہو سکتا ہے۔[1]

امام صاحب کی علمی ترقی کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ ان کو بڑے بڑے اہل کمال کی صحبتیں میسر آئیں جن شہروں میں اُن کو رہنے کا اتفاق ہوا یعنی کوفہ، بصرہ، مکہ، مدینہ یہ وہ مقامات تھے کہ مذہبی روایتیں وہاں کی ہوا میں سرایت کر گئی تھیں، علماء سے ملنے اور علمی جلسوں میں شریک ہونے کا اثر ... امام صاحب کے خمیر میں داخل تھا ساتھ ہی ان کی شہرت اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ جہاں جاتے تھے استفادہ، ملاقات، مناظرہ کی غرض سے خود ان کے پاس ہزاروں آدمیوں کا مجمع رہتا تھا۔

درس وافتاء و بقیہ زندگی

اگرچہ حماد کی زندگی ہی میں امام صاحب نے اجتہاد کا درجہ حاصل کر لیا تھا، عمر بھی کچھ کم نہ تھی یعنی حماد کی وفات کے وقت کم و بیش چالیس برس کا سن تھا تاہم شاگردانہ خلوص نے یہ گوارا نہ کیا کہ اُستاد کے ہوتے اپنا دربار الگ جمائیں۔ اگلے زمانہ میں اُستاد کیساتھ جو محبت اور ارادت آمیز تعلق ہوتا تھا آج اس کا اندازہ کرنا بھی مشکل ہے۔ خود امام صاحب سے منقول ہے کہ حماد جب تک زندہ رہے میں نے ان کے مکان کی طرف کبھی پاؤں نہ پھیلائے حماد نے ۱۲۰ھ میں قضا کی۔ چونکہ ابراہیم نخعی کے بعد فقہ کا دارومدار انہیں پر رہ گیا تھا ان کی موت نے کوفہ کو بے چراغ کر دیا۔ حماد نے ایک لائق بیٹا چھوڑا تھا۔ لوگوں نے انہیں کو مسند درس پر بٹھایا۔ لیکن وہ لغت اور عربیت کی طرف زیادہ مائل تھے۔ آخر موسیٰ بن کثیر نے کہ حماد کے شاگردوں میں تجربہ کار اور سن کے لحاظ سے سب سے زیادہ ممتاز تھے انکی جگہ لی وہ اگرچہ فقہ کے پورے ماہر نہ تھے۔ لیکن اکثر بزرگوں کی صحبتیں اٹھائی تھیں اور اس وجہ سے لوگوں پر ان کا ایک خاص اثر تھا چند روز حلقہ درس انکی وجہ سے قائم رہا۔ وہ حج کو چلے گئے۔ تمام بزرگوں نے متفقہ طور پر امام ابوحنیفہؒ سے درخواست

---

[1] مختصر تاریخ بغداد ترجمہ امام ابوحنیفہؒ۔

کی کہ مسند خلافت کو مشرف فرمائیں مختلف حالتوں کا اقتضا دیکھو یا تو وہ زمانہ تھا کہ جوانی ہی میں استادی کی مسند پر بیٹھنے کی آرزو تھی یا اب وہ لوگ درخواست کرتے ہیں اور ان کو اسکی ذمہ داری کے لحاظ سے انکار ہے۔ تاہم لوگوں کا اصرار غالب آیا اور چار و ناچار قبول کرنا پڑا۔ پھر بھی دل مطمئن نہ تھا۔ حافظ ابوالمحاسن نے لکھا ہے کہ انھیں دنوں میں خواب دیکھا کہ "پیغمبر خدا ؐ کی قبر کھود رہے ہیں" ڈر کر چونک پڑے اور سمجھے میری ناقابلیت کی طرف اشارہ ہے۔ اما ابن سیرین علم تعبیر کے استاد مانے جاتے تھے انھوں نے تعبیر بتائی کہ علم کو زندہ کرنا مقصود ہے۔ امام صاحب کو تسکین ہو گئی اور اطمینان کے ساتھ درس میں مشغول ہوئے۔ خواب کا ذکر تمام مورخوں اور محدثوں نے بھی کیا ہے۔ اس لحاظ سے گمان غالب ہے کہ اصل واقعہ صحیح ہو۔ لیکن یہ زمانہ اور ابن سیرین کی تعبیر گوئی محض غلط ہے۔ کیونکہ ابن سیرین اس سے بہت پہلے ۱۱۰ھ میں قضا کر چکے تھے۔ بہرحال امام صاحب کے استقلال کیساتھ درس و تدریس شروع کی۔ اوّل اوّل حماد کے پرانے شاگرد درس میں شریک ہوتے تھے لیکن چند دنوں کے بعد وہ شہرت ہوئی کہ کوفہ کی اکثر درسگاہیں ٹوٹ کر ان کے حلقہ میں آملیں۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ خود ان کے اساتذہ مثلاً مسعر بن کدام اعمش وغیرہ ان سے استفادہ کرتے تھے اور دوسروں کو ترغیب دلاتے تھے۔ اسپین کے سوا اسلامی دنیا کا کوئی حصہ نہ تھا جو انکی شاگردی کے تعلق سے آزاد رہا ہو۔ جن جن مقامات کے رہنے والے انکی خدمت میں پہنچے ان سب کا شمار نہیں ہو سکتا۔ لیکن جن اضلاع یا ممالک کا نام خصوصیت کے ساتھ لیا گیا ہے وہ یہ ہیں۔ مکہ، مدینہ دمشق، بصرہ، واسطہ، موصل، جزیرہ رقہ، نصیبین، رملہ، مصر، یمن، یمامہ، بحرین، بغداد اہواز، کرمان، اصفہان، حلوان، استرآباد، ہمدان، نہاوند، رے، قومس، دامغان طبرستان، جرجان، نیشاپور، سرخس، نسا، بخارا، سمرقند، کس، صغانیان، ترمذ، ہرات، قہستان، خوارزم، سیستان، مدائن، مصیصہ، حمص[1] مختصر یہ کہ انکی استادی کے حدود خلیفہ وقت کی حدود حکومت کے برابر تھے۔ رفتہ رفتہ عراق میں ان کا ملکی اثر قائم ہو گیا یہاں تک کہ ملک میں جو انقلابات ہوتے تھے لوگوں کو ان کی شرکت کا عموماً گمان ہوتا تھا۔

---

[1] عقود الجمان باب عاشر۔

زید بن علی کے خروج میں شریک تھے

شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے تحفہ میں لکھا ہے کہ "زید بن علی نے بنو امیہ کے عہد میں جو بغاوت کی تھی امام صاحب بھی اسمیں شریک تھے" نامۂ دانشوران کے مؤلفوں نے بھی ایسا ہی گمان کیا ہے۔ لیکن ہم اس پر یقین نہیں کر سکتے۔ جسقدر تاریخیں اور تاریخ کی کتابیں ہمارے سامنے ہیں ان میں کہیں اس کا ذکر نہیں۔ حالانکہ اگر ایسا ہوتا تو ایک قابلِ ذکر واقعہ تھا۔ زید بن علی نے سنہ ۱۲۱ھ میں بغاوت کی تھی اس وقت ہشام بن عبدالملک تختِ خلافت پر متمکن تھا، ہشام اگرچہ کفایت شعار اور بعض امور میں نہایت جزرس تھا لیکن اسکی سلطنت نہایت امن و امان کی سلطنت تھی۔ ملک میں ہر طرف امن و امان کا سکہ بیٹھا ہوا تھا، رعایا عموماً رضامند تھی۔ بیت المال میں ناجائز آمدنیاں داخل نہیں ہو سکتی تھیں، اس حالت میں امام ابوحنیفہ کو مخالفت کی کوئی وجہ نہ تھی۔ زید بن علی سادات میں ایک صاحب شخص تھے۔ بے شبہ ان کو بغاوت کرنی ضروری تھی کیونکہ بخیال ان کے خلافت ان کا خاص حق تھا غالباً اس غلط فہمی کا منشا یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ کا خاندان اہلِ بیت کے ساتھ ایک خاص ارادت رکھتا تھا۔ امام صاحب نے ایک مدت تک امام باقرؒ کے دامنِ فیض میں تربیت پائی تھی۔ کوفہ کی ہوا میں ایک مدت تک تشیع ہی کا اثر تھا۔ ان اتفاقی واقعات نے امام ابوحنیفہ کی نسبت یہ گمان پیدا کر دیا۔ ورنہ تاریخی شہادتیں اس کے بالکل خلاف ہیں۔ ہشام نے سنہ ۱۲۵ھ میں وفات کی۔ اس کے بعد ولید بن یزید، یزید الناقص، ابراہیم بن ولید، مروان الحمار یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے۔ عباسی خلافت کی سلسلہ جنبانی جو ایک مدت سے ہو رہی تھی مروان کے عہد میں نہایت قوت پکڑ گئی۔ ابومسلم خراسانی نے تمام ممالک میں سازشوں کا جال پھیلا دیا اور مروانی حکومت کی جڑ ہلا دی۔ چونکہ زیادہ تر فساد کا مرکز عراق اور عراق میں بھی خاص کر کوفہ تھا۔ مروان نے یزید بن عمرو بن ہبیرہ کو وہاں کا گورنر مقرر کیا جو نہایت مدبر، دلیر، فیاض، خاندانی اور صاحب اثر شخص تھا۔ یزید نے حکومت مروانی کی ترکیب کو غور سے دیکھا تھا، وہ سمجھ چکا تھا کہ اس کل میں اور سب کچھ ہے لیکن مذہبی پرزے نہیں ہیں۔ اس بنا پر اس نے چاہا کہ ایوان حکومت مذہبی ستونوں پر قائم کیا جائے۔ عراق کے تمام فقہاء کو جن میں قاضی ابن ابی لیلیٰ ابن شبرمہ اور داؤد بن ہند

بھی نا قابل تھے بلا کر بڑی خدمتیں دیں۔ امام صاحب کو میر منشی اور افسر خزانہ مقرر کرنا چاہا انھوں نے صاف انکار کر دیا۔ یزید نے قسم کھا کر کہا کہ جبراً منظور کرنا ہوگا۔ ان کے ہم صحبت بزرگوں نے بھی سمجھایا مگر یہ انکار پہ قائم رہے اور کہا کہ اگر یزید کہے کہ مسجد کے دروازے گن دو تو بھی مجھ کو گوارا نہیں نہ کہ وہ کسی مسلمان کے قتل کا فرمان لکھے اور میں اس پہ مہر کر دوں۔ یزید نے غصہ میں آکر حکم دیا کہ ہر روز ان کے دس دُرّے لگائے جائیں اس ظالمانہ حکم کی تعمیل ہوئی، تاہم وہ اپنی ضد سے باز نہ آئے۔ آخر مجبور ہو کر یزید نے چھوڑ دیا ایک روایت میں ہے کہ اسی وقت مکہ معظمہ روانہ ہوئے اور ۱۳۶ھ تک وہیں رہے۔ ابن قتیبہ وغیرہ نے لکھا ہے کہ یہ جھگڑا قضا کے قبول کرنے پر تھا۔ ممکن ہے کہ یہ عہدہ بھی ان کے لئے تجویز ہوا ہو انھوں نے اس سے بھی انکار کیا ہو۔ ۱۳۲ھ میں سلطنت اسلام نے دوسرا پہلو بدلا۔ یعنی بنو امیہ کا خاتمہ ہو گیا اور آل عباس تخت و تاج کے مالک ہوئے۔ اس خاندان کا پہلا فرماں روا ابو العباس سفاح تھا۔ اس نے چار سو برس حکومت کے بعد ۱۳۶ھ میں قضا کی۔ سفاح کے بعد اس کا بھائی منصور تخت نشین ہوا عباسیوں نے گو اموی خاندان کو بالکل تباہ کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ خلفائے بنی اُمیّہ کی قبریں اکھاڑ کر ان کی ہڈیاں تک جلا دیں۔ تاہم چونکہ نئی سلطنت تھی اور انتظام کا سکہ نہیں بیٹھا تھا، جا بجا بغاوتیں تھیں۔ ان فتنوں کو فرو کرنے میں سفاح و منصور اعتدال کی حد سے بہت دور نکل گئے اور وہ زیادتیاں کیں کہ مروانی حکومت کا نقشہ آنکھوں میں پھر گیا۔ تمام ملک کی آنکھیں اُن نئے جانشینوں پر لگی تھیں۔ لیکن ان خونریزیوں نے سب کے دل افسردہ کئے۔ چنانچہ ایک موقعہ پر منصور نے عبد الرحمٰن جو اس کا بچپن کا یار تھا پوچھا کہ ہماری سلطنت کو مروان کی سلطنت سے کیا نسبت ہے؟ اس نے کہا کہ میرے نزدیک تو کچھ فرق نہیں۔ منصور نے کہا "کیا کروں کام کے آدمی نہیں ملتے"۔ عبد الرحمٰن نے کہا بازار میں جس جنس کی زیادہ مانگ ہوتی ہے کثرت بھی اسی کی ہوتی ہے۔

اور بے رحمیاں تو کتنی ہیں۔ منصور نے یہ ستم کیا کہ سادات کی خانہ بربادی شروع

(حاشیہ: عہدۂ قضا سے انکار)

(حاشیہ: سفاح اور منصور کی سفاکیاں)

کردی۔ اس میں شبہ نہیں کہ سادات ایک مدت سے خلافت کا خیال پکار رہی تھیں اور ایک لحاظ سے ان کا حق بھی تھا۔ تاہم سفاح کی وفات تک انکی کوئی سازش ظاہر نہ ہوئی تھی ۔ صرف بدگمانی پر منصور نے سادات علویین کی بیخ کنی شروع کی جو لوگ ان میں ممتاز تھے ان کے ساتھ زیادہ بے رحمیاں کیں۔ محمد ابراہیم کہ حسن وجمال میں یگانۂ روزگار تھے اور اس وجہ سے دیباج کہلاتے تھے ان کو زندہ دیوار میں چنوا دیا ان بے رحمیوں کی ایک بڑی داستان ہے جس کے بیان کرنے کو بڑا سخت دل چاہیئے۔ آخر تنگ آکر ۱۴۵ھ میں انھیں مظلوم سادات میں سے محمد نفس ذکیہ نے تھوڑے سے آدمیوں کے ساتھ مدینہ منورہ میں خروج کیا اور چند روز میں ایک بڑی جمعیت پیدا کر لی بڑے بڑے پیشوایان مذہب حتیٰ کہ امام مالک نے فتویٰ دیدیا کہ "منصور نے جبراً بیعت لی خلافت نفس ذکیہ کا حق ہے" نفس ذکیہ اگرچہ نہایت دلیر و قوی بازو وفن جنگ سے واقف تھے لیکن تقدیر سے کس کا زور چل سکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رمضان ۱۴۵ھ میں نہایت بہادری سے لڑکر میدان جنگ میں مارے گئے ۔ ان کے بعد ابراہیم نے علم خلافت بلند کیا اور اس سروسامان سے مقابلہ کو اٹھے کہ منصور کے حواس جاتے رہے کہتے ہیں کہ اضطراب میں منصور نے دو مہینے تک کپڑے نہیں بدلے۔ سرہانے سے تکیہ اٹھا لیتا تھا اور کہتا تھا کہ " میں نہیں جانتا کہ یہ تکیہ میرا ہے یا ابراہیم کا" انھیں دنوں میں دو کنیزیں حرم میں آئیں اُن سے بات تک نہ کی۔ ایک شخص نے سبب پوچھا تو کہا " یہ فرصت کے کام ہیں۔ اس وقت تو یہ دُھن ہے کہ ابراہیم کا سر میرے آگے یا میرا سر ابراہیم کے آگے رکھا جائے گا۔"

نفس ذکیہ اور ابراہیم کی بغاوت

ابراہیم چونکہ شجاعت اور دلیری کے ساتھ بہت بڑے عالم اور رہنمائے عام بھی تھے ان کے دعویٰ خلافت پر ہر طرف سے لبیک کی صدائیں بلند ہوئیں ۔ خاص کوفہ میں کم و بیش لاکھ آدمی ان کے ساتھ جان دینے کو تیار ہو گئے ۔ مذہبی گروہ خاص کر علماء فقہاء نے عموماً ان کا ساتھ دیا۔ امام ابوحنیفہ شروع ہی سے عباسیوں کی بے اعتدالیاں دیکھتے آتے تھے، سفاح ہی کے زمانہ میں ان کی رائے قائم ہو چکی تھی

کہ یہ لوگ منصب خلافت کے شایاں نہیں ابراہیم بن میمون جو ایک نہایت دیندار عالم تھے امام
صاحب کے خاص دوستوں میں سے تھے وہ اکثر کہتے کہ ان مظالم پر کیا ہم کو چپ رہنا چاہیے؟
امام صاحب فرماتے کہ امر بالمعروف بلاشبہ فرض ہے مگر اس کے لئے سامان شرط ہے۔ لیکن
وہ مذہبی جوش میں صبر کی تاب نہ لا سکے ابو مسلم خراسانی کہ ان ظلموں کا بانی تھا اس کے پاس
گئے اور نہایت بے باکی ساتھ اس امر کے متعلق گفتگو کی۔ اس نے ان کی گستاخی یا فساد پیدا
ہونے کے احتمال سے ان کو قتل کرا دیا۔ امام ابو حنیفہ سن کر بہت روئے لیکن کیا کر سکتے یہ
۱۳۱ھ کا واقعہ ہے۔ ۱۴۵ھ میں ابراہیم نے جب علم خلافت بلند کیا تو اور پیشوایان
مذہب کی ساتھ امام صاحب نے بھی ان کی تائید کی۔ خود شریک جنگ ہونا چاہتے تھے لیکن
بعض مجبوریوں کی وجہ سے نہ ہو سکے جس کا ان کو ہمیشہ افسوس رہا۔ نامہ دانشوران میں
امام صاحب کا ایک خط نقل کیا ہے جو انھوں نے ابراہیم کو لکھا تھا۔ اس کے الفاظ یہ ہیں۔
اما بعد فانی قد جھزت الیک اربعۃ الاف درھم ولم یکن عندی غیرھا
ولولا امانات عندی للحقت بک فاذا لقیت القوم وظفرت بھم فافعل
کما فعل ابوک فی اھل صفین اقتل مفرھم واجھز علی جریحھم ولا
تفعل کما فعل ابوک فی اھل الجمل فان القوم بھم فئۃ۔ یعنی میں آپ
کے پاس چار ہزار درہم بھیجتا ہوں کہ اس وقت اسی قدر موجود تھے۔ اگر لوگوں کی امانتیں
میرے پاس نہ رکھی ہوتیں تو میں ضرور آپ سے ملتا جب آپ دشمنوں پر فتح پائیں تو وہ
برتاؤ کریں جو آپ کے باپ (حضرت علیؓ) نے صفین والوں کے ساتھ کیا تھا زخمی اور بھاگ
جانیوالے سب قتل کئے جائیں، وہ طریقہ اختیار نہ کیجئے گا جو آپ کے والد نے حرب
جمل میں جائز رکھا تھا کیونکہ مخالف بڑی جمعیت رکھتا ہے۔" نامۂ دانشوران میں اس
خط کی نسبت لکھا ہے کہ معتبر کتابوں میں منقول ہے لیکن کسی خاص کتاب کا نام نہیں
بتایا۔ اس لئے ہم اس کی صحت پر یقین نہیں کر سکتے۔ یہ خط صحیح ہو یا غلط مگر اس میں شبہ
نہیں کہ امام صاحب ابراہیم کے اعلانیہ طرفدار تھے اور بجز اس کے کہ خود شریک جنگ
نہ ہو سکے اور ہر طرح پر ان کی مدد کی۔ ابراہیم نے اپنی بے تدبیری سے شکست کھائی اور

بصرہ میں نہایت دلیری سے لڑ کر مارے گئے۔ اس مہم سے فارغ ہو کر منصور ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوا جنھوں نے ابراہیم کا ساتھ دیا ان میں امام صاحب بھی تھے۔ اس وقت تک منصور کا پایہ تخت ہاشمیہ ایک مقام تھا جو کوفہ سے چند میل کے فاصلے پر ہے لیکن چونکہ کوفہ والے سادات کے سوا اور کسی خاندان کو خلافت کا مستحق نہیں سمجھتے تھے منصور نے ایک دوسرے دارالخلافہ کی تجویز کی اور بغداد کو انتخاب کیا۔ ۱۴۶ھ میں بغداد پہنچکر امام ابو حنیفہ کے نام فرمان بھیجا کہ فوراً پایۂ تخت پر حاضر ہوں۔ وہ بنو امیہ کی تباہی کے بعد مکہ معظمہ سے چلے آئے تھے اور کوفہ میں مقیم تھے۔ منصور نے گو پہلے ہی ان کے قتل کا ارادہ کر لیا تھا تاہم بہانہ ڈھونڈھتا تھا۔ دربار میں حاضر ہوئے تو ربیع نے کہ حجابہ کا عہدہ رکھتا تھا ان لفظوں سے ان کو دربار میں پیش کیا " یہ دنیا کا سب سے بڑا عالم ہے " منصور نے پوچھا تم نے کس علم کی تحصیل کی؟ امام نے استادوں کے نام بتائے جن کا سلسلۂ شاگردی بڑے بڑے صحابہ تک پہنچتا ہے۔ منصور نے انکے لئے قضا کا عہدہ تجویز کیا۔ امام صاحب نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ " میں اس کی قابلیت نہیں رکھتا " منصور نے غصہ میں آ کر کہا " تم جھوٹے ہو " امام صاحب نے کہا " اگر میں جھوٹا ہوں تو یہ دعویٰ ضرور سچا ہے کہ میں عہدۂ قضا کے قابل نہیں کیونکہ جھوٹا شخص قاضی مقرر نہیں ہو سکتا۔

یہ تو ایک منطقی لطیفہ تھا۔ لیکن در اصل وہ قضا کی ذمہ داریاں نہیں اٹھا سکتے تھے۔ انھوں نے منصور کے سامنے اپنی ناقابلیت کی جو وجہیں بیان کیں وہ بالکل بجا تھیں یعنی یہ کہ " مجھکو اپنی طبیعت پر اطمینان نہیں " میں عربی النسل نہیں ہوں اسلئے اہل عرب کو میری حکومت ناگوار ہو گی۔ درباریوں کی تعظیم کرنی پڑے گی اور یہ مجھ سے ہو نہیں سکتا۔ پھر بھی منصور نہ مانا اور قسم کھا کر کہا تم کو قبول کرنا ہو گا امام صاحب نے بھی قسم کھائی کہ ہر گز قبول نہ کروں گا۔ اس جرأت اور بے باکی پر تمام دربار حیرت زدہ تھا۔ ربیع نے غصہ میں آ کر کہا ابو حنیفہ! تم امیر المؤمنین کے مقابلے میں قسم کھاتے ہو؟ امام صاحب نے فرمایا " ہاں! کیونکہ امیر المؤمنین کو قسم کا کفارہ ادا کرنا میری نسبت زیادہ آسان ہے۔

خطیب کی ایک اور روایت ہے کہ منصور نے زیادہ جبر کیا تو مجبوراً دار القضا میں

امام ابو حنیفہ بغداد طلب کئے گئے

عہدۂ قضا سے انکار

جا کر بیٹھے۔ ایک مقدمہ پیش ہوا جس میں قرضہ کا دعویٰ تھا لیکن ثبوت کے گواہ نہ تھے
مدعا علیہ کو سرے سے انکار تھا۔ امام صاحب نے حسب قاعدہ مدعا علیہ سے کہا کہ تم
قسم کھاؤ کہ مدعی کا تم پر کچھ دینا نہیں آتا، وہ تیار ہو گیا۔ واللہ کا لفظ کہا تھا کہ امام صاحب
نے گھبرا کر روک دیا اور آستین سے کچھ روپے نکال کر مدعی کے حوالے کیئے کہ تم اپنا قرض لو
ایک مسلمان کو قسم کیوں کھلاتے ہو۔ عدالت سے آکر منصور سے کہہ دیا کہ مجھ سے کسی
طرح یہ کام نہیں چل سکتا۔ اس پر حکم ہوا کہ قید خانہ بھیجے جائیں جس سے اس وقت
چھوٹے کہ۔ قید حیات سے چھوٹے۔ اس مدت میں منصور ان کو قید خانہ سے بلا لیتا
علمی بحثیں کرتا۔

وفات رجب سنہ ۱۵۰ھ

منصور نے امام کو سنہ ۱۴۶ھ میں قید کیا لیکن اس حالت میں بھی اس کو ان کی طرف
سے اطمینان نہ تھا۔ بغداد دارالخلافہ ہونے کی وجہ سے علوم و فنون کا مرکز بن گیا تھا۔
طالبان کمال ممالک اسلامی کے ہر گوشہ سے اٹھ کر بغداد ہی کا رخ کرتے تھے۔ امام
صاحب کی شہرت دور دور پہنچ چکی تھی۔ قید کی حالت نے انکے اثر اور قبول عام کو
بجائے کم کرنے کے اور زیادہ کر دیا تھا۔ بغداد کی علمی جماعت جس کا شہر میں بہت
کچھ اثر تھا ان کے ساتھ نہایت خلوص رکھتی تھی۔ ان باتوں کا یہ اثر تھا کہ منصور نے
ان کو نظر بند کر رکھا تھا لیکن کوئی امر ان کے آداب اور تعظیم کے خلاف نہ کر سکتا تھا۔
قید خانہ میں ان کا سلسلہ تعلیم بھی برابر قائم رہا۔ امام محمد نے کہ فقہ حنفی کے دست و
بازو ہیں قید خانہ ہی میں اُن سے تعلیم پائی۔ ان وجوہ سے منصور کو امام صاحب کی
طرف سے جو اندیشہ تھا وہ قید خانہ کی حالت میں بھی باقی رہا جس کی آخری تدبیر یہ تھی کہ
بیخبری میں ان کو زہر دلوا دیا۔ جب ان کو زہر کا اثر محسوس ہوا تو سجدہ کیا اور اسی حالت
میں کی قضا کی۔ ان کے مرنے کی خبر نہایت جلد شہر میں پھیل گئی اور سارا بغداد امنڈ آیا
حسن بن عمارہ نے کہ قاضی شہر تھے غسل دیا۔ نہلاتے تھے اور کہتے جاتے تھے "واللہ تم

سب سے بڑے فقیہ، بڑے عابد، بڑے زاہد تھے، تم میں تمام خوبیاں جمع تھیں۔ تم نے اپنے جانشینوں کو مایوس کر دیا کہ وہ تمہارے مرتبہ کو پہنچ سکیں، غسل سے فارغ ہوتے ہوتے وہ لوگوں کو کثرت ہوئی کہ پہلی بار نماز جنازہ میں کم و بیش پچاس ہزار مجمع تھا۔ اس پر بھی آنیوالوں کا سلسلہ قائم تھا یہاں تک چھ بار نماز پڑھی گئی اور عصر کے قریب جا کر لاش دفن ہو سکی۔ امام نے وصیت کی تھی کہ خیزران کے مقبرہ میں دفن کئے جائیں کیونکہ ان کے خیال میں مغصوب نہ تھی۔ اس وصیت کے موافق خیزران کے مشرقی جانب اُن کا مقبرہ تیار ہوا۔ مورخ خطیب نے لکھا ہے کہ دفن کے بعد بھی بیس دن تک لوگ ان کے جنازہ کی نماز پڑھا کئے۔ قبول عام کی اس سے زیادہ کیا دلیل ہوگی۔ اس وقت اِن ممالک میں بڑے ائمہ مذہب موجود تھے جن میں بعض خود امام صاحب کے استاد تھے سب نے اُن کے مرنے کا رنج کیا اور نہایت تاسف آمیز الفاظ کہے۔ ابن جریج مکہ میں تھے سن کر کہا۔ انا للہ بڑا علم جاتا رہا" شعبہ بن الحجاج نے کہ امام ابوحنیفہ کے شیخ اور بصرہ کے امام تھے نہایت افسوس کیا اور کہا "کوفہ میں اندھیرا ہو گیا" اس واقعہ کے چند روز بعد عبداللہ بن المبارک کو بغداد جانے کا اتفاق ہوا امام کی قبر پر گئے اور رو کر کہا" ابوحنیفہ! خدا تم پر رحم کرے ابراہیم مرے تو اپنا جانشین چھوڑ گئے۔ افسوس تم نے دنیا میں کسی کو اپنا جانشین نہ چھوڑا۔

امام کا مزار ایک مدت تک بوسہ گاہِ خلائق رہا اور آج بھی ہے۔ سلطان الپ ارسلان سلجوقی نے کہ بڑی عظمت و شان کا فرمانروا اور نہایت عادل و فیاض تھا ۴۵۹ھ میں ان کی قبر پر ایک قبہ اور اس کے قریب ایک مدرسہ تیار کیا۔ غالباً بغداد میں یہ پہلا مدرسہ تھا کیونکہ نظامیہ جو تمام اسلامی مدرسوں کا آدم خیال کیا جاتا ہے وہ اسی سنہ میں لیکن اس کے بعد تعمیر ہوا۔ رفعت اور خوبی عمارت کے لحاظ سے بھی لاجواب تھا۔ ابوسعید شرف الملک کہ الپ ارسلان کا مستوفی تھا اس کے اہتمام سے عمارت تیار ہوئی۔ افتتاح کی رسم میں بغداد کے تمام علماء اور عمائد شریک تھے۔ اتفاق سے اسی وقت ابوجعفر مسعود جو ایک مشہور شاعر تھا آنکلا اور برجستہ یہ اشعار پڑھے :۔

الم تر ان العلم کان مبددا — فجمعه هذا المغیب فی اللحد
کذلک کانت هذه الارض میتة — فانشرها فعل الجمید ابی سعید

یعنی تم دیکھتے نہیں! علم کس طرح ابتر ہو رہا تھا پھر اس کو ترتیب دی جو اس لحد میں مدفون ہے اسی طرح یہ زمین مردہ پڑی تھی ابوسعید کی کوشش نے اس کو دوبارہ زندہ کیا" یہ مدرسہ جو مشہد ابوحنیفہ کے نام سے مشہور ہے مدت تک قائم رہا اور بڑے بڑے نامور علماء اس کے پروفیسر مقرر ہوئے جن کے نام اور اجمالی حالات الجواہر المضئیہ فی طبقات الحنفیہ میں اکثر پائے جاتے ہیں ۴۹۳؁ھ میں حکیم ابن جزلہ نے کہ مقتدر باللہ کے دربار کا مشہور عالم تھا اپنی تمام کتابیں اس مدرسہ پر وقف کیں۔ اس مدرسہ کے متعلق ایک مسافر خانہ بھی شامل تھا شائقان علم جو اطراف ملک سے آکر بغداد میں عارضی قیام کرتے تھے ان کو وہاں سے کھانا ملتا تھا۔ ایشیا کا مشہور سیّاح ابن بطوطہ جس وقت بغداد میں پہنچا ہے عباسی حکومت کا اخیری زمانہ تھا وہ اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے کہ اس وقت تمام بغداد میں مشہد ابی حنیفہ کے سوا کوئی زاویہ موجود نہیں ہے جہاں مسافروں کو کھانا ملتا ہو۔ آج بھی ان کا مقبرہ بغداد کے مشہور اور متبرک مقامات میں سے ہے۔ حال کے شاہان سلطان ناصر الدین قاچار خلد اللہ سلطنتہ نے اپنے حالات سفر میں ان کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ میں نے امام ابوحنیفہ کے مزار پر فاتحہ پڑھی اور نذر چڑھائی" علم کی شان دیکھو جسکی بدولت، کوفہ کے بزاز نے یہ رتبہ حاصل کیا کہ بارسو برس کے بعد آج اس کے مزار پر بڑے بڑے شاہنشاہوں کے سر جھکتے ہیں۔

امام کی اولاد

امام صاحب کی اولاد کا مفصل حال معلوم نہیں مگر اسقدر یقینی ہے کہ وفات کے وقت حماد کے سوا اور کوئی اولاد موجود نہ تھی۔ حماد بڑے رتبہ کے فاضل تھے بچپن میں ان کی تعلیم نہایت اہتمام سے ہوئی تھی چنانچہ جب الحمد ختم کی ان کے پدر بزرگوار نے اس تقریب میں معلم کو پانچسو درہم نذر کئے۔ بڑے ہوئے تو خود امام صاحب سے مراتب علمی کی

تکمیل کی۔ علم وفضل کے ساتھ بے نیازی اور پرہیزگاری میں بھی باپ کے خلف الرشید تھے۔ امام صاحب نے جب انتقال کیا تو ان کے گھر میں لوگوں کا بہت سا مال واسباب امانت رکھا تھا۔ انھوں نے قاضی شہر کے پاس حاضر کیا کہ جن کی امانتیں ہیں ان کو پہنچادی جائیں۔ قاضی نے صاحب نے کہا ابھی اپنے پاس رہنے دو کہ زیادہ حفاظت سے رہے گا۔ انھوں نے کہا کہ آپ ان کی جانچ کرلیں کہ میرے باپ کا ذمہ بری ہوجائے غرض تمام مال واسباب قاضی صاحب کو سپرد کرکے خود روپوش ہوگئے اور اسوقت ظاہر ہوئے کہ وہ چیزیں کسی اور رہتم کے اہتمام میں دیدی گئیں۔ تمام عمر کسی کی ملازمت نہیں کی اور نہ شاہی دربار سے تعلق پیدا کیا، ذیقعدہ ۱۷۶ھ میں قضا کی، چار بیٹے چھوڑے۔ عمر، اسمٰعیل، ابوحیان، عثمان۔ اسمٰعیل نے علم وفضل میں نہایت شہرت حاصل کی۔ مامون الرشید نے ان کو عہدۂ قضا پر مامور کیا جس کو انھوں نے اس دیانتداری اور انصاف سے انجام دیا کہ جب بصرہ سے چلے تو سارا شہر ان کی مشایعت کو نکلا اور سب لوگ ان کی جان ومال کو دعائیں دیتے تھے۔[۱] مساور نے ان کی مدح میں کہا ہے[۲]

اذا ما الناس یوماً قایسونا	بابدة من الفتیا طریفه
اتیناهم بمقیاس صحیح	تلاد من طراز ابی حنیفه
اذا سمع الفقیه بها وعاها	واثبتها بحبر فی الصحیفه

امام صاحب کی معنوی اولاد تو آج دنیا میں پھیلی ہوئی ہے اور شاید چھ سات کروڑ سے کم نہ ہوگی، لیکن ان کی جسمانی اولاد بھی جابجا موجود ہے۔ خود ہندوستان میں متعدد خاندان ہیں جن کا سلسلۂ نسب امام تک پہنچتا ہے اور خدا کے فضل سے علم وفضل کا جوہر بھی نسلاً بعد نسلٍ ان کی میراث میں چلا آتا ہے۔

اخلاق وعادات

ہمارے تذکرہ نویسوں نے اخلاق وعادات کی جو تصویر کھینچی ہے اس میں خوش اعتقادی اور مبالغہ کا اسقدر رنگ بھرا ہے کہ امام صاحب کی اصلی صورت اچھی طرح پہچانی

[۱] ابن خلکان ترجمہ حماد ۱۲ [۲] معارف ابن قتیبہ ترجمہ امام ابوحنیفہؒ ۱۲

نہیں جاتی چالیس برس تک عشاء کے وضو سے صبح کی نماز پڑھی، تیس برس تک متصل روزے
رکھے اور جہاں وفات کی اس جگہ سات ہزار بار قرآن ختم کیا، نہر کوفہ میں مشتبہ گوشت
کا ٹکڑا پایا تو اس خیال سے کہ مچھلیوں نے کھایا ہوگا اور مچھلیاں بہت دنوں تک زندہ
رہتی ہیں ایک مدت تک مچھلی نہیں کھائی، اسی طرح ایک شبہہ پر بکری کا گوشت کھانا چھوڑ
دیا، اُن ذاتی صَرف صِرف دس آنے ماہوار تھا یہ اس قسم کے بہت سے افسانے ان کی نسبت
ہیں اور لطف یہ کہ ہمارے مومنین انھیں دور از کار قصوں کو امام کے کمالات کا جوہر
سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ واقعات نہ تاریخی اصول سے ثابت ہیں نہ ان سے کسی کے شرف
پر استدلال ہو سکتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ امام صاحب کے جن فضائل یا عام حالات کو ہم صحیح
تسلیم کرتے ہیں وہ بھی انھیں کتابوں سے ماخوذ ہیں جن میں یہ فضول قصے مذکور ہیں لیکن
ہر واقعہ کی حیثیت الگ ہوتی ہے اور اسی اعتبار سے شہادت کی حیثیت [illegible]
معمولی واقعات میں عام شہادتیں کافی ہیں لیکن اس قسم کے واقعات [illegible] مسند
درکار ہے جس میں ذرا بھی شبہہ کی گنجائش نہ ہو۔ یعنی حدیث مرفوع متصل کے لیے جو قیدیں
ضروری ہیں ان سے بھی بڑھ کر ساتھ ہی روایت کے اصول پر منطبق ہو۔ امام صاحب کی
دانشمندی دقیقہ سنجی نکتہ شناسی پر نگاہ پڑتی ہے جن کا ثبوت سمعی نہیں عیانی موجود ہے تو
ان واقعات پر مشکل سے یقین آسکتا ہے جو نہایت اور بے اعتدالی کی حد سے بھی متجاوز ہیں۔
امام صاحب کے محاسن اخلاق کی صحیح مگر اجمالی تصویر دیکھنی ہو تو قاضی ابو یوسف کی
تقریر سنو جو انھوں نے ہارون رشید کے سامنے بیان کی تھی۔ ہارون نے ایک موقع پر
صاحب موصوف سے کہا کہ ابو حنیفہ کے اوصاف بیان کیجئے۔ انھوں نے کہا کہ جہاں تک
میں جانتا ہوں ابو حنیفہ کے اخلاق و عادات یہ تھے کہ نہایت پرہیزگار تھے منہیات سے
بچتے تھے، اکثر چپ رہتے تھے اور سوچا کرتے تھے کوئی شخص مسئلہ پوچھتا اور ان کو معلوم
ہوتا تو جواب دیتے ورنہ خاموش رہتے۔ نہایت سخی اور فیاض تھے کسی کے آگے حاجت
نہ لیجاتے، اہل دنیا سے احتراز تھا۔ دنیاوی جاہ و عزت کو حقیر سمجھتے تھے، غیبت سے
بہت بچتے تھے۔ جب کسی کا ذکر کرتے تو بھلائی کے ساتھ کرتے بہت بڑے عالم تھے اور

مال کی طرح علم کے صرف کرنے میں بھی فیاض تھے، ہارون الرشید نے یہ سن کر کہا کہ "صالحین کے یہی اخلاق ہوتے ہیں" عام نگاہوں میں یہ باتیں چنداں وقعت نہیں رکھتیں۔ لیکن رُوحانی اوصاف کے نکتہ شناس سمجھ سکتے ہیں کہ یہ طرزِ زندگی ظاہر میں جسقدر سادہ اور آسان ہے درصل اسی قدر مشکل اور قابل قدر ہے۔

امام صاحب کا حلیہ و پوشاک

امام صاحب کو خدا نے حسنِ سیرت کے ساتھ جمالِ صورت بھی دیا تھا۔ میانہ قد، خوش رو اور موزوں اندام تھے۔ گفتگو نہایت شیریں اور آواز بلند اور صاف تھی کیسا ہی پیچیدہ مضمون ہو نہایت صفائی اور فصاحت سے ادا کر سکتے تھے، مزاج میں تکلّف تھا اور اکثر خوش لباس رہتے تھے۔ کبھی کبھی سنجاب و قاقم کے جبّے بھی استعمال کرتے تھے۔ ابومطیع بلخی ان کے شاگرد کا بیان ہے کہ میں نے ایک دن ان کو نہایت قیمتی چادر اور قمیص پہنے دیکھا جن کی قیمت کم ازکم چار سو درہم ہوگی۔ ایک دن نضر بن محمد ان سے ملنے گئے۔ امام صاحب کہیں باہر جانے کی تیاری کر رہے تھے اُن سے کہا ذرا دیر کے لئے اپنی چادر مجھے دیدو۔ واپس آئے تو شکایت کی کہ ناحق تمہاری چادر لے کر مجھے شرمندہ ہونا پڑا۔ انھوں نے کہا کیوں؟ فرمایا بہت گندہ ہے۔ نضر کہتے ہیں میں نے وہ چادر پانچ دینار کو خریدی تھی اور مجھ کو اس پر ناز تھا اس لئے امام صاحب کی شکایت سے تعجّب ہوا۔ لیکن دوسرے موقع پر جب میں نے ان کو ایک چادر اوڑھے دیکھا جو تیس دینار سے کم قیمت کی نہ تھی تو وہ تعجّب جاتا رہا۔

درباری ٹوپی

خلیفہ منصور نے درباریوں کے لئے خاص قسم کی ٹوپیاں ایجاد کی تھیں جو نرکل وغیرہ سے بنتی تھیں اور ان پر سیاہ کپڑا منڈھا ہوتا تھا۔ چونکہ نہایت لمبی ہوتی تھیں ابودلامہ شاعر نے ظرافةً کہا۔

کنا نرجی من امام زیادة فزاد الامام المرتضی فی القلانس

یعنی "ہم کو خلیفہ سے اضافہ کی امید تھی سو حضرت نے اضافہ کیا تو ٹوپیوں میں کیا"

امام صاحب اگرچہ دربار سے کوسوں بھاگتے تھے لیکن اس قسم کی ٹوپی جو اہل دربار اور اُمراء کے ساتھ مخصوص تھی کبھی کبھی استعمال کرتے تھے۔ دُنیادار دولتمندوں کے لئے تو ایک معمولی بات ہے لیکن علماء کے دائرہ میں یہ امر تعجّب کی نگاہ سے دیکھا گیا۔

امام صاحب کے توشہ خانے میں اکثر سات آٹھ ٹوپیاں موجود رہتی تھیں اور یاتوں میں

بھی امام صاحب کا طرزِ معاشرت ان حیثیتوں میں اور علماء سے بالکل جدا تھا انکے ہمعصر عموماً شاہی دربار یا وزراء اور امراء کے وظیفہ خوار تھے اور اس کو عیب نہیں سمجھتے تھے قاضی ابن عبد البر پر کسی نے اعتراض کیا تھا کہ آپ امراء کے وظیفہ خوار ہیں انھوں نے اس کے جواب میں بعض صحابہ اور تبع تابعین کی نظریں پیش کیں جو امراء کے روزینے اور انعامات سے زندگی بسر کرتے تھے۔ اگرچہ ہم اس کو نئے خیال والوں کی طرح کاہلی اور مفت خوری کا اثر نہیں سمجھتے کیونکہ اس زمانہ تک تعلیم کا سلسلہ معاوضہ کی بنیاد پر نہیں قائم ہوا تھا، علماء بطور خود اپنے گھروں پر یا مسجدوں میں لوگوں کو مفت تعلیم دیتے تھے اور یہ سلسلہ اس قدر وسیع اور مفید تھا کہ آج تک اس سے بڑھ کر نہ ہو سکا۔ امراء کے ہاں سے ان لوگوں کے لئے جو وظیفے مقرر تھے یا کبھی کبھی صلہ و نذر کے طور پر مل جاتا تھا اسکو ان آنریری پروفیسروں کی تنخواہ سمجھ لینا چاہیئے۔ لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ رفتہ رفتہ انھیں مثالوں سے پیرزادگی اور مفت خوری کی بنیاد قائم ہو گئی تھی جس نے قوم کے ایک بڑے حصہ کو بالکل نکما اور اپاہج بنا دیا۔ بے شبہہ امام ابو حنیفہ اس اصول کے سرے سے مخالف تھے اور اس لحاظ سے ان کی مخالفت بجا بھی تھی۔ اس بے تعلقی سے ایک بڑا فائدہ یہ تھا کہ امر حق کے اظہار میں امام صاحب کو کسی سے باک نہیں ہوتا تھا۔ انسان کتنا ہی آزاد مزاج اور صاف گو ہو لیکن احسان وہ چھپا ہوا جادو ہے کہ جس کے اثر سے بچنا ناممکن نہیں تو قریباً ناممکن ہے امام صاحب تمام عمر کسی کے احسان مند نہ ہوئے اور اس وجہ سے ان کی آزادی کو کوئی چیز دبا نہ سکتی تھی۔ اکثر موقعوں پر وہ اس بات کا اظہار بھی کر دیا کرتے تھے۔ ابن ہبیرہ نے کہ کوفہ کا گورنر اور نہایت نامور شخص تھا ان سے بلجاجت کہا آپ کبھی کبھی قدم رنجہ فرماتے تو مجھ پر احسان ہوتا فرمایا "میں تم سے مل کر کیا کروں گا۔ مہربانی سے پیش آؤ گے تو خوف ہے کہ تمہارے دام میں آجاؤں، عتاب کرو گے تو میری ذلت ہے۔ تمہارے پاس جو زر و مال ہے مجھ کو اس کی حاجت نہیں۔ میرے پاس جو دولت ہے اس کو کوئی شخص چھین نہیں سکتا عیسیٰ بن موسیٰ کے ساتھ بھی ایسا ہی گذرا۔

وظیفہ خوری سے اجتناب

آزادی اور بے نیازی

خلیفہ منصور اور حرّہ خاتون (منصور کی بیوی) میں کچھ شکر رنجی ہو گئی تھی۔ خاتون کو شکایت تھی کہ خلیفہ عدل نہیں کرتا۔ منصور نے کہا کسی منصف قرار دو۔ اس نے امام صاحب کا نام لیا، اسی وقت طلبی کا فرمان گیا۔ خاتون پردے کے قریب بیٹھی کہ امام صاحب جو فیصلہ کریں خود اپنے کانوں سے سنے۔ منصور نے پوچھا شرع کی رُو سے مرد کتنے نکاح کر سکتا ہے؟ امام صاحب نے کہا چار۔ منصور خاتون کی طرف مخاطب ہوا کہ سُنتی ہو۔؟ پردہ سے آواز آئی کہ ہاں سُنا۔ امام صاحب نے منصور کی طرف خطاب کر کے کہا مگر یہ اجازت اس شخص کے لئے خاص ہے جو عدل پر قائم ہو ورنہ ایک سے زیادہ نکاح کرنا اچھا نہیں خود خدا فرماتا ہے:۔ وَاِنْ خِفْتُمْ اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَۃً منصور چپ ہو گیا۔ اِمام صاحب گھر آئے تو ایک خادم پچاس ہزار درہم کے توڑے لئے ہوئے حاضر ہوا کہ خاتون نذر بھیجی ہے اور کہا ہے کہ "آپ کی کنیز" آپ کو سلام کہتی ہے اور آپ کی حق گوئی کی نہایت شکور ہے۔ امام صاحب نے روپے پھیر دیئے اور خادم سے فرمایا کہ خاتو سے کہنا کہ میں نے جو کچھ کہا ہے کسی غرض نہیں کہا بلکہ میرا فرض منصبی تھا۔

بے لوث حق گوئی

امام صاحب کی تجارت نہایت وسیع تھی لاکھوں کا لین دین تھا۔ اکثر شہروں میں گماشتے مقرر تھے بڑے بڑے سوداگروں سے معاملہ رہتا تھا۔ ایسے بڑے کارخانہ کے ساتھ دیانت او[illegible] کا اسقدر خیال رکھتے تھے کہ ناجائز طور پر ایک حبہ بھی ان کے خزانے میں نہیں [illegible] سکتا تھا۔ اس احتیاط میں کبھی کبھی نقصان اٹھانا پڑتا تھا مگر اُن کو کچھ پروا نہ ہوتی تھی۔ ایک دفعہ حفص بن عبدالرحمٰن کے پاس خز کے تھان بھیجے اور کہلا بھیجا کہ فلاں فلاں تھان میں عیب ہے خریدار کو جتا دینا۔ حفص کو اس ہدایت کا خیال نہ رہا تھان بیچ ڈالے اور خریداروں کو اس عیب سے اطلاع نہ دی۔ امام صاحب کو معلوم ہوا تو نہایت افسوس کیا تھانوں کی قیمت جو تیس ہزار درہم تھی سب خیرات کر دی۔

تجارت دیانت

ایک دن ایک عورت خز کا تھان لے کر آئی کہ فروخت کرا دیجئے۔ امام صاحب نے دام پوچھے اس نے سو روپے بتائے۔ فرمایا کم ہیں۔ اُس نے کہا دوسو روپے فرمایا

تھان پانچسو سے کم قیمت کا نہیں۔ اس نے متعجب ہو کر کہا کہ آپ شاید ہنسی کرتے ہیں امام صاحب نے پانچسو روپیہ اپنے پاس سے دیدیے اور تھان رکھ لیا۔ اس احتیاط اور دیانت نے انکے کارخانے کو بجائے نقصان پہنچانے کے اور بھی زیادہ چمکا دیا۔ تجارت اور اکتساب دولت سے ان کا مقصود زیادہ تر عوام کو فائدہ پہنچانا تھا، جتنے احباب اور ملنے والے تھے سب کے روزینے مقرر کر دیتے تھے، شیوخ اور محدثین کے لئے تجارت کا ایک حصہ مخصوص کر دیا تھا کہ اس سے جو نفع ہوتا تھا سال کے سامان لوگوں کو پہنچا دیا جاتا تھا[1]۔ عام رواج تھا کہ گھر والوں کے لئے کوئی چیز خریدتے تو اسی قدر محدثین اور علماء کے پاس بھجواتے۔ اتفاقیہ کوئی شخص ملنے آتا تو اس کا حال پوچھتے اور حاجتمند ہوتا تو حاجت روائی کرتے شاگردوں میں جس کو تنگ حال دیکھتے اس کی ضروریات خانگی کی کفالت کرتے کہ اطمینان سے علم کی تحصیل کر سکے بہت سے لوگ جن کو مفلسی کی وجہ سے تحصیل علم کا موقعہ نہیں مل سکتا تھا امام صاحب ہی کی دستگیری کی بدولت بڑے بڑے رتبوں پر پہنچے انھیں میں ابو یوسف بھی ہیں جن کا مفصل تذکرہ آگے آتا ہے۔

فیاضی

شاگردوں کے ساتھ سلوک

ایک دفعہ کچھ لوگ ملنے آئے ان میں ایک شخص ظاہری صورت سے شکستہ حال معلوم ہوتا تھا۔ لوگ رخصت ہو کر چلے تو امام صاحب نے اس سے فرمایا کہ ذرا ٹھہر جاؤ۔ جائے نماز کی طرف اشارہ کیا کہ اس کو اٹھانا۔ اس نے دیکھا تو ہزار روپے کی تھیلی تھی۔ عرض کی میں دولتمند ہوں مجھ کو اس کی ضرورت نہیں۔ فرمایا تو صورت ایسی بنانی چاہیئے کہ دوسروں کو شبہ نہ ہو۔

ایک دفعہ کسی بیمار کی عیادت کو جا رہے تھے راہ میں ایک شخص ملا جو ان کا مقروض تھا اس نے دور سے ان کو دیکھ لیا اور کترا کر دوسری طرف چلا انھوں نے پکارا کہاں جاتے ہو؟ وہ ٹھہرا ہو گیا۔ قریب پہنچے تو پوچھا مجھ کو دیکھ کر تم نے راستہ کیوں کاٹا؟ اس نے کہا آپ کے دس ہزار درہم مجھ پر آتے ہیں جو مجھ سے اب تک ادا نہ ہو سکے اس شرم سے آنکھ برابر نہیں ہوتی امام صاحب اس کی غیرت سے متعجب ہوئے اور فرمایا جاؤ میں نے سب معاف کر دیا۔

ایک بار سفر حج میں عبد اللہ سہمی کا ساتھ ہوا۔ کسی منزل میں ایک بدوی نے ان کو

[1] علامہ نووی نے تہذیب الاسماء میں ان واقعات کو بسند بیان کیا ہے۔

پکڑا اور امام صاحب کے سامنے لایا کہ اس پر میرے روپئے آتے ہیں اور ادا نہیں کرتا۔ امام صاحب نے عبداللہ سے اس کی حقیقت پوچھی۔ انھوں نے سرے سے انکار کیا۔ امام صاحب نے بدوی سے پوچھا آخر کتنے درہموں پر جھگڑا ہے؟ اس نے کہا چالیس درہم متعجب ہو کر فرمایا آخر زمانہ سے حمیت اٹھ گئی اتنے سے معاملہ پر فضیحتی! پھر کل درہم اپنے پاس سے ادا کر دیئے۔ ابراہیم بن عتبہ چار ہزار درہم کے مقروض تھے اور اس ندامت کی وجہ سے لوگوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا تھا ان کے ایک دوست نے چندہ کر کے ان کا قرض ادا کرنا چاہا۔ لوگوں نے بقدر حیثیت ان کی اعانت کی۔ امام صاحب کے پاس گئے تو فرمایا کل قرضہ کس قدر ہے؟ انھوں نے کہا چار ہزار۔ اتنی سی رقم کے لئے لوگوں کو کیوں تکلیف دیتے ہو۔ یہ کہہ کر پورے چار ہزار درہم خود دیدیئے۔ تاریخوں میں اس قسم کے بہت سے واقعات ان کی نسبت منقول ہیں ہم نے اختصار کے لحاظ سے قلم انداز کئے اس دولت مندی اور عظمت و شان کے ساتھ نہایت متواضع حلیم اور حلیق تھے۔ ایک دفعہ مسجد خیف میں تشریف رکھتے تھے شاگردوں اور ارادتمندوں کا حلقہ تھا ایک شخص نے مسئلہ پوچھا امام صاحب نے جواب مناسب دیا اس نے کہا "مگر حسن بصریؒ نے اس کے خلاف بتایا ہے" امام صاحب نے فرمایا: "حسن نے غلطی کی" حاضرین میں سے ایک شخص کہ حسن بصری کا معتقد تھا طیش میں آ گیا اور جھلا کر کہا" او ابن الفاحشہ! تو حسن کو خاطی کہتا ہے" اس گستاخی اور بیہودہ گوئی نے تمام مجلس کو درہم برہم کر دیا اور لوگوں نے چاہا کہ اس کو پکڑ کر سزا دیں۔ امام صاحب نے روکا ان کے لحاظ سے لوگ مجبور ہو گئے مگر دیر تک مجلس میں سناٹا رہا۔ لوگوں کا جوش کم ہوا تو امام صاحب نے اس شخص کی طرف خطاب کیا اور فرمایا کہ" ہاں حسن نے غلطی کی، عبداللہ بن مسعود نے اس بات میں جو روایت کی وہ صحیح ہے۔

یزید بن کمیت کا بیان ہے کہ ایک دفعہ میں امام ابو حنیفہ کی خدمت میں حاضر تھا ایک شخص نے ان سے گستاخانہ گفتگو شروع کی۔ امام صاحب تحمل سے جواب دیتے تھے وہ اور شوخ ہوتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے امام کو زندیق کہدیا اس پر فرمایا کہ خدا تم کو بخشے وہ خوب جانتا ہے کہ میری نسبت جو تم نے لفظ کہ وہ صحیح نہیں ہے امام مذہب

خود فرمایا کرتے تھے کہ میں نے کسی پر لعنت نہیں کی کسی سے انتقام نہیں لیا کسی مسلمان یا ذمی کو نہیں ستایا کسی سے فریب اور بد عہدی نہیں کی۔

امام سفیان ثوری اور امام صاحب میں کچھ شکر رنجی تھی ایک شخص نے امام صاحب سے آکر کہا سفیان ثوری آپ کو برا کہہ رہے تھے۔ امام صاحب نے فرمایا کہ "خدا میری اور سفیان کی مغفرت کرے سچ یہ ہے کہ ابراہیم نخعی کے موجود ہوتے بھی اگر سفیان دنیا سے اٹھ جاتے تو مسلمانوں کو سفیان کے مرنے کا ماتم کرنا پڑتا۔

ایک دن مسجد میں درس دے رہے تھے ایک شخص نے جس کو ان سے عداوت تھی عام مجلس میں ان کی نسبت ناسزا الفاظ کہے انھوں نے کچھ التفات نہ کی اور اسی طرح درس میں مشغول رہے شاگردوں سے بھی منع کر دیا کہ اس کی طرف متوجہ نہ ہوں۔ درس سے اٹھے تو وہ شخص ساتھ ہوا اور جو کچھ منہ میں آتا تھا بکتا جاتا تھا امام صاحب اپنے گھر کے قریب پہنچے تو کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ بھائی یہ میرا گھر ہے کچھ باقی رہ گیا ہو تو اٹھا نہ رکھیو کہ اب میں اندر جاتا ہوں تم کو موقع نہ ملے گا۔ ایک اور دن حلقۂ درس قائم تھا۔ ایک نوعمر نے مسئلہ پوچھا امام صاحب نے جواب دیا۔ اس نے کہا ابوحنیفہ تم نے جواب میں غلطی کی۔ ابو الخطاب جرجانی بھی حلقہ میں شریک تھے ان کو نہایت غصہ آیا اور حاضرین کو ملامت کی کہ تم لوگ بڑے بے حمیت ہو امام کی شان میں ایک لونڈا جو جی میں آتا ہے کہہ جاتا ہے تم کو ذرا جوش نہیں آتا۔ امام صاحب نے ابو الخطاب کی طرف خطاب کیا اور فرمایا کہ ان لوگوں پر کچھ الزام نہیں۔ میں اس جگہ بیٹھا ہوں کہ لوگ آزادانہ میری رائے کی غلطیاں ثابت کریں اور میں تحمل کے ساتھ سنوں۔

محلہ میں ایک موچی رہتا تھا جو نہایت رنگین طبع اور خوش مزاج تھا اس کا معمول تھا کہ دن بھر مزدوری کرتا شام کو بازار جا کر گوشت اور شراب مول لاتا کچھ رات گئے دوست احباب جمع ہوتے خود سیخ پر کباب لگاتا اور یاروں کو کھلاتا ساتھ ہی شراب کا دور چلتا اور مزے میں آکر یہ شعر گاتا ؎

اضاعونی وای فتی اضاعوا لیوم کریہۃ وسداد ثغر

بعض لوگوں نے مجھ کو ہاتھ سے کھو دیا اور کیسے بڑے شخص کو کھو یا جو لڑائی کے اور رخنہ بندی کے دن کام آتا ہے۔ امام صاحب رات کو کم سوتے تھے اس کی نغمہ سنجیاں سنتے اور فرط اخلاق کی وجہ سے تعرض نہ کرتے۔ ایک رات کو توال شہر ادھر آنکلا اور اس غریب کو گرفتار کر کے قید خانہ میں بھیج دیا۔ صبح کو امام صاحب نے دوستوں سے تذکرہ کیا ہمارے ہمسایہ کی آواز نہیں آئی۔ لوگوں نے رات کا ماجرا بیان کیا۔ اسی وقت سواری طلب کی اور دربار کے کپڑے پہنے اور دار الامارۃ کا قصد کیا۔ یہ عباسی عہد حکومت تھا اور عیسیٰ ابن موسیٰ کہ خلیفہ منصور کا برادر زادہ تھا اور تمام خاندان میں عقل و تدبیر دلیری اور شجاعت کے اعتبار سے ممتاز تھا کوفہ کا گورنر تھا۔ لوگوں نے اطلاع دی کہ امام ابو حنیفہ آپ کے ملنے کو آتے ہیں۔ اس نے درباریوں کو استقبال کے لئے بھیجا اور حکم دیا کہ دار الامارۃ کے صحن تک امام صاحب کو سواری پر لائیں۔ سواری قریب آئی تو تعظیم کو اٹھا اور نہایت ادب سے لا کر بٹھایا پھر عرض کی آپ نے کیوں تکلیف فرمائی مجھ کو بلا بھیجتے کہ میں خود حاضر ہوتا۔ امام صاحب نے فرمایا ہمارے محلہ میں ایک موچی رہتا تھا کوتوال نے اس کو گرفتار کر لیا ہے۔ میں چاہتا ہوں وہ رہا کر دیا جائے۔ عیسیٰ نے اسی وقت داروغہ جیل کو حکم بھیجا اور وہ رہا کر دیا گیا۔ امام صاحب عیسیٰ سے رخصت ہو کر چلے تو موچی ہمرکاب ہوا۔ امام اس کی طرف مخاطب ہوئے کہ کیوں ہم نے تم کو ضائع تو نہیں کیا۔؟ یہ اس شعر کی طرف اشارہ تھا جس کو وہ ہمیشہ پڑھا کرتا تھا اضاعونی و ای فتی اضاعوا۔ اس نے عرض کیا کہ نہیں آپ نے ہمسایگی کا پورا حق ادا کیا۔ اس کے بعد اس نے عیش پرستی سے توبہ کی اور امام صاحب کے حلقۂ درس میں بیٹھنے لگا۔ رفتہ رفتہ علم فقہ میں مہارت حاصل کی اور فقیہ کے لقب سے ممتاز ہوا۔

امام صاحب کے والد نے سن رشد سے پہلے قضا کی لیکن والدہ مدت تک زندہ رہیں۔ اور امام کو ان کی خدمت گذاری کا کافی موقع ہاتھ آیا۔ وہ مزاج کی

ؔ یہ واقعہ بہت سی کتابوں میں مختلف طریقے سے مذکور ہے میں نے کتاب الاغانی و ابن خلکان و عقود الجمان کی روایت اختیار کی ہے ۔

شکی تھیں اور عورتوں کا قاعدہ ہے واعظوں اور قصہ گویوں کے ساتھ نہایت عقیدت رکھتی تھیں۔ کوفہ میں عمرو بن ذرا ایک مشہور واعظ تھے خاص عقیدت تھی۔ کوئی مسئلہ پیش آتا تھا تو امام صاحب کو حکم دیتیں کہ عمرو بن ذرار سے پوچھ آؤ۔ امام تعمیل کے لئے ان کے پاس جا کر مسئلہ پوچھتے وہ عذر کرتے کہ آپ کے سامنے میں کیا زبان کھول سکتا ہوں ارشاد فرماتے کہ " والدہ کا یہی حکم ہے " اکثر ایسا ہوتا کہ عمرو کو مسئلہ کا جواب نہ آتا امام صاحب سے درخواست کرتے کہ آپ مجھ کو بتا دیں میں اس کو آپ کے سامنے دہرا دوں گا۔

کبھی کبھی اصرار کرتیں کہ میں خود چل کر پوچھوں گی خچر پر سوار ہوتیں امام صاحب پاپیادہ ساتھ ہوتے خود مسئلہ کی صورت بیان کرتیں اور اپنے کانوں سے جواب سن لیتیں تب تسکین ہوتی۔ ایک دفعہ امام صاحب سے پوچھا کہ یہ صورت پیش آئی ہے مجھ کو کیا کرنا چاہئے؟ امام صاحب نے جواب بتایا۔ بولیں تمہاری سند نہیں زرعہ واعظ تصدیق کریں تو مجھ کو اعتبار آئے۔ امام صاحب ان کو لے کر زرعہ کے پاس گئے اور مسئلہ کی صورت بیان کی۔ زرعہ نے کہا بالکل صحیح ہے۔ سن کر ان کو تسکین ہوئی۔ اور گھر واپس آئیں۔ ابن ہبیرہ نے جب امام صاحب کو بلا کر میر منشی مقرر کرنا چاہا اور انکار کے جرم پر دُرّے لگوائے اس وقت امام صاحب کی والدہ زندہ تھیں ان کو نہایت صدمہ ہوا۔ امام صاحب فرمایا کرتے تھے کہ مجھ کو اپنی تکلیف کا چنداں خیال نہ تھا البتہ یہ رنج ہوتا کہ میری تکلیف کی وجہ سے والدہ کے دل کو صدمہ پہنچتا ہے۔

امام صاحب اگرچہ نہایت رقیق القلب تھے اور کسی کو تکلیف اور رنج کی حالت میں دیکھتے تو بیتاب ہو جاتے۔ ایک دفعہ مسجد میں بیٹھے تھے کسی نے آکر کہا کہ فلاں شخص کوٹھے پر سے گر پڑا، دفعتہً اس زور سے چیخ اٹھے کہ مسجد میں تہلکہ پڑ گیا حلقہ درس چھوڑ کر برہنہ پا دوڑے اور اس شخص کے گھر پر جا کر بہت کچھ غمخواری اور ہمدردی کی جب تک وہ اچھا نہ ہوا روزانہ صبح کو جاتے اور اس کی تیمارداری کرتے۔ تاہم

رقت طبع

استقلال

اپنے اوپر کوئی مصیبت آپڑتی تو استقلال سے برداشت کرتے کہ لوگوں کو تعجب ہوتا۔ عمال
اور اہل دربار کے ہاتھوں سے اکثر ان کو تکلیفیں پہنچیں مگر ان کے پائے ثبوت کو لغزش نہیں
ہوئی ۔ نہایت مضبوط دل رکھتے تھے اور ضبط و استقلال گویا مایہ خمیر تھا۔

ایک دن جامع مسجد میں درس دے رہے تھے مستفیدوں اور ارادتمندوں کا
مجمع تھا اتفاقاً چھت سے ایک سانپ گرا اور امام کی گود میں آیا تمام لوگ گھبرا کر بھاگ
گئے ۔ مگر وہ اسی اطمینان سے بیٹھے رہے ۔ امام مالکؒ کو بھی ایک بار ایسا اتفاق پیش آیا
وہ ان کی تاریخ زندگی کا مشہور اور دلچسپ واقعہ ہے ۔

بات نہایت کم کرتے تھے اور غیر ضروری باتوں میں کبھی دخل نہ دیتے ۔ درس
میں بھی معمول تھا کہ شاگرد آپس میں نہایت آزادی سے بحثیں کرتے آپ چپ چاپ بیٹھے
سنا کرتے ۔ جب بحث زیادہ بڑھ جاتی اور کسی بات کا تصفیہ نہ ہوتا تو قول فیصل بیان
کر دیتے کہ سب کو تشفی ہو جاتی ۔

حفظ لسان

غیبت سے پرہیز رکھتے تھے اس نعمت کا شکر ادا کرتے کہ خدا نے میری زبان کو اس
آلودگی سے پاک رکھا ۔ ایک شخص نے کہا حضرت لوگ آپ کی شان میں کیا کچھ نہیں کہتے
مگر آپ سے میں نے کسی کی برائی نہیں سنی ۔ فرمایا ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ
یَّشَاءُ ۔ امام ابو سفیان سے کسی نے کہا ابوحنیفہ کو میں نے کسی کی غیبت کرتے نہیں سنا،
انھوں نے کہا کہ "ابوحنیفہ ایسے بیوقوف نہیں کہ اعمال صالحہ کو برباد کریں"

قسم کھانی بہت برا جانتے تھے اور اس سے پرہیز کرتے تھے ۔ عہد کر لیا تھا کہ اتفاقاً
بھی اس خطا کا مرتکب ہوں گا تو ایک درہم کفارہ دوں گا ۔ اتفاق سے بھول گئے کسی
موقع پر قسم کھالی ۔ اس کے بعد عہد کیا کہ اب بجائے درہم کے دینار دوں گا ۔

نہایت مرتاض اور زاہد تھے ۔ ذکر و عبادت میں ان کو مزا آتا تھا اور بڑے
ذوق و خلوص سے ادا کرتے تھے ۔ اس باب میں ان کی شہرت ضرب المثل ہو گئی تھی۔
علامہ ذہبی نے لکھا ہے کہ "ان کی پرہیزگاری اور عبادت کے واقعات تواتر کی حد تک
پہنچ گئے ہیں" اکثر نماز میں قرآن پڑھنے کے وقت رقت طاری ہوتی اور گھنٹوں رویا

کرتے۔ ابراہیم بصری کا بیان ہے کہ ایک دفعہ نماز فجر میں امام ابو حنیفہ کے ساتھ شریک تھا امام نے نماز میں یہ آیت پڑھی وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ٥ یعنی خدا کو ظالموں کے کردار سے بے خبر نہ سمجھنا" امام ابو حنیفہ پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ سارا بدن کانپنے لگا۔ زائدہ کہتے ہیں کہ مجھ کو ایک ضروری مسئلہ دریافت کرنا تھا امام ابو حنیفہ کے ساتھ نماز عشاء میں شریک ہوا اور منتظر تھا کہ نوافل سے فارغ ہوں تو دریافت کروں۔ وہ قرآن پڑھتے اس آیت پر پہنچے وَوَقٰنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ بار اس آیت کو پڑھتے تھے یہاں تک کہ صبح ہو گئی اور یہی آیت پڑھتے رہے۔ ایک بار نماز میں آیت پڑھی بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمَرُّ یعنی قیامت گنہگاروں کا وعدہ گاہ ہے اور قیامت سخت مصیبت کی چیز اور ناگوار چیز ہے" اسی آیت میں رات ختم ہو گئی بار بار پڑھتے تھے اور روتے جاتے تھے۔ یزید بن کمیت ایک مشہور عابد اور امام صاحب کے ہمعصر تھے ان کا بیان ہے کہ میں ایک دفعہ نماز عشاء میں امام ابو حنیفہ کیساتھ شریک تھا امام نماز نے اِذَا زُلْزِلَتِ پڑھی۔ لوگ نماز پڑھ کر چلے گئے میں ٹھہر رہا۔ امام ابو حنیفہ کو دیکھا کہ بیٹھے ٹھنڈی سانسیں بھر رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر میں اٹھ آیا کہ ان کے اوقات میں خلل نہ ہو۔ صبح کو مسجد میں گیا تو دیکھا کہ غمزدہ بیٹھے ہیں ڈاڑھی ہاتھ میں ہے اور بڑی رقت سے کہہ رہے ہیں کہ" اے وہ جو ذرہ بھر نیکی اور ذرہ بھر بدی دونوں کا بدلہ دے گا نعمان اپنے غلام کو آگ سے بچانا" ایک دن بازار میں چلے جاتے تھے ایک لڑکے کے پاؤں پر پاؤں پڑ گیا وہ چلا اٹھا اور کہا تو خدا سے نہیں ڈرتا امام کو غش آ گیا۔ مسعر بن کدام ساتھ تھے انھوں نے سنبھالا۔ ہوش میں آئے تو پوچھا ایک لڑکے کی بات پر اس قدر بیقرار ہو جانا کیا بات تھی" فرمایا" کیا عجب کہ اس کی آواز غیبی ہدایت ہو" ایک دفعہ حسب معمول دوکان پر گئے۔ نوکر نے کپڑوں کے تھان نکال کر رکھے اور تفاؤل کے طور پر کہا" خدا ہم کو جنت دے" امام صاحب پر رقت طاری ہوئی اور اس قدر روئے کہ شانے تر ہو گئے۔ نوکر سے کہا کہ دکان بند کر دو آپ چہرہ پر رومال ڈال کر کسی طرف نکل گئے۔ دوسرے دن دکان پر گئے تو نوکر سے کہا کہ

"بھائی! ہم اس قابل کہاں کہ جنت کی آرزو کریں یہی بہت ہے کہ عذاب الٰہی میں گرفتار نہ ہوں " حضرت عمر فاروقؓ بھی اکثر فرمایا کرتے تھے کہ قیامت کے دن مجھ سے مواخذہ نہ ہو نہ انعام ملے تو بالکل راضی ہوں " ایک دفعہ کسی کو مسئلہ بتا رہے تھے ایک شخص نے کہا کہ ابو حنیفہ! خدا سے ڈر کر فتویٰ دینا " امام صاحب پر اس احساس کا اس قدر اثر ہوا کہ چہرے کی رنگت زرد پڑ گئی۔ اس شخص کی طرف مخاطب ہوئے اور کہا :-

بھائی تم کو خدا جزائے خیر کرے اگر مجھ کو یہ یقین نہ ہوتا کہ خدا مجھ سے مواخذہ کرے گا کہ تو نے جان کر علم کو کیوں چھپایا تو میں ہرگز فتویٰ نہ دیتا " کوئی مسئلہ مشکل آجاتا اور جواب نہ معلوم ہوتا تو متردد ہوتے کہ غالباً میں کسی گناہ کا مرتکب ہوا ہوں اسی کی شامت ہے پھر وضو کر کے نماز پڑھتے اور استغفار کرتے۔ فضیل بن عیاضؒ مشہور صوفی گذرے ہیں اُن سے کسی نے یہ حکایت بیان کی بہت روئے اور کہا کہ " ابو حنیفہؒ کے گناہ بہت کم تھے اس لئے ان کا خیال ہوتا تھا، جو لوگ گناہوں میں ان پر ہزاروں آفتیں آتی ہیں اور مطلق خبر نہیں ہوتی کہ غلطی تنبیہ ہے۔

معمول تھا کہ صبح نماز کے بعد مسجد میں درس دیتے۔ دُور دُور سے استفتے آئے ہوئے ہوتے تو جواب لکھتے پھر تدوین فقہ کی مجلس منعقد ہوتی بڑے بڑے شاگردوں کا مجمع ہوتا۔ جو مسائل اتفاق رائے سے طے ہوتے قلمبند کر لیے جاتے۔ نماز ظہر پڑھ کر گھر آتے۔ گرمیوں میں ہمیشہ ظہر کے بعد سو رہتے۔ نماز عصر کے بعد کچھ دیر تک درس دینے کا مشغلہ رہتا باقی وقت دوستوں کے ملنے ملانے، بیماروں کی عیادت، ماتم پرسی غریبوں کی خبر گیری میں صرف ہوتا، مغرب کے بعد درس کا سلسلہ شروع ہوتا اور عشاء تک رہتا نماز عشاء پڑھ کر عبادت میں مشغول اور اکثر رات بھر نہ سوتے۔ جاڑوں میں مغرب کے بعد مسجد میں سو رہتے اور قریباً دس بجے اٹھ کر نماز عشاء پڑھتے۔ پھر تمام رات تہجد اور درود وظائف میں گزرتی، کبھی کبھی دکان پر بیٹھتے اور وہیں یہ تمام مشاغل انجام پاتے۔

ذہانت اور طبّاعی فتوے اور مناظرات، نصائح اور دلپذیر باتیں

جو چیز امام صاحب کی قوت ایجاد، جدّتِ طبع، دقتِ نظر، وسعتِ معلومات، غرض ان کے تمام کمالاتِ علمی کا آئینہ ہے وہ علم فقہ ہے جس کی ترتیب و تدوین میں ان کو وہ پایہ حاصل ہے جو ارسطو کو منطق اقلیدس کو ہندسہ میں۔ لیکن اس پر تفصیلی بحث کرنے کیلئے ایک مستقل کتاب درکار ہے۔ اسی ضرورت سے ہم نے اپنی کتاب کا دوسرا حصّہ اس بحث کے لئے خاص کر دیا ہے۔ اس موقع پر صرف واقعات لکھتے ہیں جو امام صاحب کی علمی تاریخ کے عام واقعات ہیں لیکن غور سے دیکھو تو وہ بھی بجائے خود صول ہیں جن پر سینکڑوں مسائل کی بنیاد قائم ہے۔

اس مقام پر یہ کہہ دینا ضرور ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کے مناظرات نکتہ آفرینیوں کے متعلق بہت بے سروپا افسانے شہرت پکڑ گئے ہیں اور طرہ یہ ہے کہ بعض مشہور مصنفوں نے بغیر تحقیق و تنقید کے ان کو اپنی تالیفات میں نقل کر دیا جس سے عوام کو اپنے خیالات کیلئے ایک دستاویز ہاتھ میں آگئی۔ یہ ایک عام قاعدہ ہے کہ جو شخص کسی فن میں کمال کے ساتھ شہرت عام حاصل کرتا ہے اس کی نسبت اچھی یا بُری سینکڑوں روایتیں خود بخود پیدا ہو جاتی ہیں اور بعض حالتوں میں اس قدر عام زبانوں پر قبضہ کر لیتی ہیں کہ خواص تک کو ان پر تواتر کا دھوکا ہو جاتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ معتقدین جوش اعتقاد میں ایسی باتیں بیان کر جاتے ہیں جن کو وہ مدح سمجھتے ہیں اور دراصل ذم ہوتی ہیں۔ اسی طرح مخالف منقصت کی مثالیں پیش کرتا ہے حالانکہ غور سے دیکھئے تو ان واقعات سے بجائے اس کے کہ ایک شخص کی برائی ثابت ہو مدح کا پہلو نکلتا ہے۔ امام ابو حنیفہ بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ بعض مصنفوں نے ان کی ذہانت اور طباعی کے ذیل میں بہت سے ایسے قصّے لکھ دیے ہیں جن کو ہم خدانخواستہ سچ تسلیم کر لیں تو عیاذاً باللہ امام صاحب کو چلتا ہوا چالاک منطقی، سخن ساز ماننا پڑے گا۔ لیکن وہ روایتیں تاریخی اصول سے ثابت نہیں اور اس وجہ سے اہل تحقیق خصوصاً محدثین نے ان کے لکھنے سے ہمیشہ پرہیز کیا ہے ہم بھی

ان کو نظرانداز کرتے ہیں ۔

اس میں شبہہ نہیں کہ امام صاحب کو اور ائمہ کی نسبت مناظرہ اور مباحثہ کے موقعے زیادہ پیش آئے، انھوں نے علوم شرعیہ کے متعلق بہت بہت سے ایسے نکتے ایجاد کئے تھے جو عام طبیعتوں کی دسترس سے باہر تھے ۔ اس لئے ظاہر بینوں کا ایک گروہ جن میں بعض مقدس اور سادہ دل بھی شامل تھے ان کا مخالف ہو گیا تھا اور ہمیشہ ان سے بحث و مناظرہ کے لئے تیار رہتا تھا ۔ امام صاحب کو مجبوراً ان کے شبہات رفع کرنے پڑتے تھے ۔ اس اتفاق سبب نے مناظرہ اور مباحثہ کا ایک وسیع سلسلہ قائم کر دیا تھا ۔ لیکن امام صاحب کے مناظرات اسی بنار پر محدود نہیں ۔ مناظرہ اس وقت درس کا ایک خاص طریقہ تھا اور امام صاحب نے اکثر اساتذہ سے اسی طریقہ پر تعلیم پائی تھی ۔ عیون الحدائق کے مصنف نے ان کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ انھوں نے شعبی، طاؤس، عطار سے مناظرات کئے ۔ یہ لوگ امام صاحب کے اساتذہ خاص ہیں اور وہ ان لوگوں کا نہایت ادب کرتے تھے ۔ اس مناظرہ سے مقصود وہی درس کا مخصوص طریقہ ہے جو اس عہد میں عموماً مروّج تھا[1]

امام اوزاعی کہ اقلیم شام کے امام اور مذہب مستقل کے بانی تھے مکہ معظمہ میں امام ابوحنیفہ رح سے ملے اور کہا کہ " عراق والوں سے نہایت تعجب ہے کہ رکوع میں اور رکوع سے سر اٹھانے کے وقت رفع یدین نہیں کرتے حالانکہ میں نے زہری سے انہوں نے سالم بن عبداللہ سے انھوں نے عبداللہ بن عمر سے سنا ہے کہ رسول اللہ صلعم ان موقعوں پر رفع یدین کرتے تھے ۔ امام ابوحنیفہ نے اس کے مقابلے میں حماد، ابراہیم نخعی، علقمہ، عبداللہ بن مسعودؓ کے سلسلہ سے حدیث روایت کی کہ آنحضرتؐ ان موقعوں پر رفع یدین نہیں کرتے تھے " امام اوزاعی نے کہا سبحان اللہ! میں تو زہری، سالم، عبداللہ کے ذریعہ سے حدیث بیان کرتا ہوں کہ آپ اس کے مقابلہ میں حماد، ابراہیم نخعی، علقمہ کا نام لیتے

رفع یدین کے مسئلے میں امام اوزاعی سے مناظرہ

---

[1] امام صاحب کے بعض مناظرات مورخ خطیب نے تاریخ بغداد میں اور امام رازی نے اس آیت کی تفسیر وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا میں لکھے ہیں اور عقود الجمان میں زیادہ اختصار کیا ہے اور حجۃ اللہ البالغہ کے مختلف مقامات سے اس کے اشارے پائے جاتے ہیں ۔

ہیں۔" امام ابو حنیفہ نے کہا کہ میرے رواۃ آپ کے رواۃ سے زیادہ فقیہ ہیں اور عبد اللہ بن مسعودؓ کا رتبہ تو معلوم ہی ہے اس لئے ان کی روایت کو ترجیح ہے۔" امام رازی نے اس مناظرہ کو مناقب الشافی میں نقل کیا ہے[1] اور گو واقعہ کی صحت سے انکار نہیں کر سکتے تاہم یہ نکتہ چینی کی ہے کہ حدیثی واقعات میں تفقہ کو کیا دخل ہے۔

اس اصول پر مفصل بحث کتاب کے دوسرے حصہ میں ہوگی یہاں امام اوزاعی کے حوالہ سے یہ مقصود ہے کہ اصل واقعہ صحیح ہے جس سے شافعیوں کو بھی انکار نہیں۔ اس مسئلہ کے متعلق امام محمد نے کتاب الحج میں ایک لطیف بحث کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ہماری روایت عبد اللہ بن مسعودؓ تک منتہی ہوتی ہے اور فریق مخالف کی عبد اللہ بن عمرؓ تک۔ اس لئے بحث کا تمام تر مدار اس پر آجاتا ہے کہ ان دونوں میں کس کی روایت ترجیح کے قابل ہے؟ عبد اللہ بن مسعودؓ آں حضرتؐ کے زمانہ میں اخیر عمر کو پہنچ چکے تھے جیسا کہ حدیثوں میں آیا ہے جماعت کی صف اوّل میں جگہ پاتے تھے۔ بخلاف اس کے عبد اللہ بن عمرؓ کا محض آغاز تھا اور ان کو دوسری تیسری صف میں کھڑا ہونا پڑتا تھا اسلئے آں حضرتؐ کے حرکات و سکنات سے واقف ہونے کے جو موقعے عبد اللہ بن مسعودؓ کو مل سکے عبد اللہ بن عمرؓ کو کیونکر حاصل ہو سکتے تھے امام محمد کا یہ طرز استدلال حقیقت میں اصول و روایت پر مبنی ہے۔ امام ابو حنیفہ صاحبؒ نے اپنی تقریر میں عبد اللہ بن مسعودؓ کی عظمت و شان کا جو تذکرہ کیا ہے اس میں اُسی کی طرف اشارہ ہے۔ ایک دن بہت سے لوگ جمع ہو کر آئے کہ قرأۃ خلف الامام کے مسئلہ میں امام صاحب سے بحث کریں۔ امام صاحب نے کہا" اتنے آدمیوں میں تنہا کیوں کر بحث کر سکتا ہوں۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ آپ اس مجمع میں سے کسی کو انتخاب کرلیں جو سب کی طرف سے اس خدمت کا کفیل ہو اور اس کی تقریر پورے مجمع کی تقریر سمجھی جائے لوگوں نے منظور کیا۔ امام صاحب نے کہا آپ نے یہ تسلیم کیا تو بحث کا بھی خاتمہ ہو گیا آپ نے جس طرح ایک شخص کو سب کی طرف سے بحث کا مختار کر دیا اسی طرح امام نماز میں بھی تمام مقتدیوں کی طرف سے قرأت کا کفیل ہے۔

قرأت خلف امام

---

[1] علامہ ابن الہمام نے اس مناظرہ کو فتح القدیر میں ذکر کیا ہے اور حجۃ اللہ البالغہ مختلف مقامات اس کے اشارے پائے جاتے ہیں۔

یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ امام نے ایک شرعی مسئلہ کو صرف عقلی طور پر طے کر دیا۔ بلکہ
یہ اس حدیث کی تشریح ہے جس کو خود امام صاحب نے بسند صحیح رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم تک پہنچایا ہے کہ من صلی خلف الامام فقرأۃ الامام قرأۃ لہ ۔ یعنی جو
امام کے پیچھے نماز پڑھے تو امام کی قرأت ہی اس کی قرأت ہے " یہ امام صاحب کے مختصات
میں سے ہے کہ وہ مشکل سے مشکل مسئلہ کو ایسے عام فہم طریقہ سے سمجھا دیتے کہ مخاطب کے ذہن
نشین ہو جاتا تھا اور وہ بحث نہایت جلد اور آسانی سے طے ہو جاتی تھی ۔

ایک خارجی سے گفتگو

ایک دفعہ ضحاک خارجی جو خارجیوں کا مشہور سردار تھا اور بنی امیہ کے زمانہ میں
کوفہ پر قابض ہو گیا تھا امام صاحب کے پاس آیا اور تلوار دکھا کر کہا کہ " توبہ کرو "
نے پوچھا کس بات سے ؟ ضحاک نے کہا تمہارا عقیدہ ہے کہ علی علیہ السلام نے معاویہ کے
جھگڑے میں ثالثی مان لی تھی، حالانکہ جب وہ حق پر تھے تو ثالث ماننے کے کیا معنی ؟ امام
صاحب نے فرمایا اگر میرا قتل مقصود ہے تو اور بات ہے ورنہ اگر تحقیق حق منظور ہے تو مجھ کو
تقریر کرنے کی اجازت دو ۔ ضحاک نے کہا میں بھی مناظرہ ہی چاہتا ہوں ۔ امام صاحب
نے فرمایا اگر بحث آپس میں طے نہ ہو تو کیا علاج ؟ ہم دونوں ایک شخص کو منصف قرار دیں
چنانچہ ضحاک کے ساتھیوں میں سے ہی ایک شخص انتخاب کیا گیا کہ دونوں فریق کی صحت اور
غلطی کا تصفیہ کرے ۔ امام صاحب نے فرمایا یہی تو حضرت علیہ السلام نے بھی کیا تھا
ان پر الزام کیا ہے ؟" ضحاک دم بخود ہو گیا اور چپکا اٹھ کر چلا گیا ۔ اسی ضحاک نے ایک بار
کوفہ پہنچ کر قتل عام کا حکم دیا ۔ امام صاحب کو خبر ہوئی دوڑے گئے اور پوچھا کہ آخر ان
لوگوں نے کیا جرم کیا ہے ؟ اس نے کہا یہ سب مرتد ہو گئے ہیں ۔ امام صاحب نے فرمایا
پہلے ان لوگوں کا کچھ اور مذہب تھا جس کو انھوں نے چھوڑ دیا، یا ہمیشہ سے یہی مذہب
رکھتے تھے جو اب رکھتے ہیں ؟ ضحاک نے کہا یہ کیا کہا پھر کہنا ۔ امام صاحب نے دوبارہ
وضاحت سے بیان کیا ۔ ضحاک نے کہا بے شبہہ میری خطا تھی ۔ اسی وقت حکم دیا کہ تلواریں
نیام کر لی جائیں ۔

رفع یدین کے مسئلے میں امام اوزاعی سے مناظرہ

قتادہ بصری سے مناظرہ

قتادہ بصری جن کا مختصر حال امام صاحب کے اساتذہ کے ذکر میں ہم لکھ

ہیں کوفہ میں آئے اور اشتہار دیا کہ "مسائل فقہ میں جس کو پوچھنا ہو تو پوچھے میں ہر مسئلے کا جواب دوں گا" چونکہ وہ مشہور محدث اور امام تھے بڑا مجمع ہوا، جوق جوق لوگ آتے تھے اور مسئلے دریافت کرتے تھے۔ امام ابوحنیفہ بھی موجود تھے۔ کھڑے ہو کر پوچھا کہ "ایک شخص سفر میں گیا، برس دو برس کے بعد اس کے مرنے کی خبر آئی اس کی بیوی نے دوسرا نکاح کر لیا اور اس سے اولاد ہوئی، چند روز کے بعد وہ شخص واپس آیا، اولاد کی نسبت اس کو انکار ہے کہ میری صلب سے نہیں ہے۔ زوج ثانی دعویٰ کرتا ہے کہ میری ہے تو آیا دونوں اس پر زنا کا الزام لگاتے ہیں یا صرف وہ شخص جو ولدیت سے انکار کرتا ہے؟ قتادہ نے کہا "یہ صورت پیش آئی ہے؟" امام نے کہا نہیں لیکن علماء کو پہلے سے تیار رہنا چاہیئے کہ وقت پر تردد نہ ہو۔ قتادہ کو فقہ سے زیادہ تفسیر میں دعویٰ تھا۔ بولے کہ ان مسائل کو رہنے دو۔ تفسیر کے متعلق جو پوچھنا ہو پوچھو۔ امام ابوحنیفہ نے کہا اس آیت کے کیا معنے قَالَ الَّذِي عِنْدَهُ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ أَنَا آتِيكَ بِهِ قَبْلَ أَنْ يَرْتَدَّ إِلَيْكَ طَرْفُكَ ۔ یہ وہ قصّہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے درباریوں سے بلقیس کے تخت لانے کی فرمائش کی اور ایک شخص نے جو غالباً آصف بن برخیا حضرت سلیمان کے وزیر تھے دعویٰ کیا کہ چشم زدن میں لا دوں گا۔ اہل کتاب کی روایت ہے کہ آصف بن برخیا اسم اعظم جانتے تھے جس کی تاثیر سے ایک دم میں شام سے یمن پہنچ کر تخت اٹھا لائے۔ یہی روایت عام مسلمانوں میں پھیل گئی تھی اور اسی کے مطابق اس آیت کا مطلب لگایا جاتا تھا۔ قتادہؒ نے یہی معنے بیان کئے۔ امام ابوحنیفہ نے کہا۔ "حضرت سلیمانؑ خود بھی اسم اعظم جانتے تھے یا نہیں۔؟ قتادہ نے کہا نہیں" امام صاحب نے کہا کیا آپ اس بات کو جائز رکھتے ہیں کہ نبی کے زمانے میں ایسا شخص موجود ہو جو خود نبی نہ ہو اور نبی سے زیادہ علم رکھتا ہو۔؟ قتادہ کچھ جواب نہ دے سکے اور کہا کہ عقائد کے متعلق پوچھو۔ امام صاحب نے کہا "آپ مومن ہیں؟" اکثر محدثین اپنے آپ کو مومن کہتے ہوئے ڈرتے تھے اور اس کو احتیاط میں داخل سمجھتے تھے۔ حسن بصریؒ سے ایک شخص نے یہ سوال کیا تھا جس کے جواب میں انھوں نے کہا کہ انشاء اللہ۔

پوچھنے والے نے کہا انشاء اللہ کا کیا محل ہے؟ فرمایا میں اپنے تئیں مؤمن تو کہدوں مگر ڈرتا ہوں کہ خدا یہ نہ کہدے کہ تو جھوٹ کہتا ہے۔" قتادہ نے بھی امام ابو حنیفہ کے سوال کا یہی جواب دیا۔ لیکن حقیقت میں یہ ایک قسم کی وہمی حالت ہے۔ ایمان اعتقاد کا نام ہے۔ جو شخص خدا رسولؐ پر اعتقاد رکھتا ہے وہ قطعاً مؤمن ہے اور اس کو کہنا چاہیئے کہ میں مؤمن ہوں۔ البتہ اگر اس میں شک ہے تو قطعی کافر ہے اور پھر انشاء اللہ کہنا بیکار ہے۔ امام ابو حنیفہ نے اس غلطی کو مٹانا چاہا۔ قتادہ سے پوچھا آپ نے یہ قید کیوں لگائی؟ انھوں نے کہا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا تھا کہ مجھ کو امید ہے کہ خدا قیامت کے دن میرے گناہوں کو معاف کر دے۔ امام ابو حنیفہ نے کہا کہ خدا نے حضرت ابراہیمؑ سے جب یہ سوال کیا کہ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ تو انھوں نے جواب میں "بلٰی" کہا تھا۔ یعنی ہاں میں مؤمن ہوں۔ آپ نے حضرت ابراہیمؑ کے اس قول کی تقلید کیوں نہ کی؟ قتادہ ناراض ہو کر اٹھے اور گھر میں چلے گئے۔

یحیٰی بن سعید انصاری کوفہ کے قاضی تھے اور منصور عباسی کے دربار میں بڑا جاہ و اعتبار رکھتے تھے تاہم کوفہ میں ان کا وہ اثر قائم نہ ہو سکتا تھا جو امام ابو حنیفہ صاحب کا تھا اور اس پر ان کو تعجب ہوتا تھا اور لوگوں سے کہا کرتے تھے کہ "کوفہ والے بھی عجب سادہ دل ہیں تمام شہر ایک شخص کے اشاروں پر حرکت کرتا ہے۔" امام ابو حنیفہ نے ابو یوسف و زفر اور چند شاگردوں کو بھیجا کہ قاضی یحیٰی سے مناظرہ کریں۔ امام ابو یوسف نے تقریر شروع کی۔ مسئلہ یہ تھا کہ اگر ایک غلام دو شخصوں میں مشترک ہو اور صرف ایک شخص آزاد کرنا چاہے تو کر سکتا ہے یا نہیں؟ قاضی یحیٰی نے کہا "نہیں کر سکتا۔ کیونکہ حدیث میں آیا ہے لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ یعنی وہ کام جس سے کسی شخص کو ضرر پہنچے جائز نہیں۔ صورت زیر بحث میں چونکہ دوسرے شخص کا ضرر ہے اس لئے شریک اوّل ایسے فعل کا مجاز نہیں ہو سکتا۔" امام ابو یوسف نے کہا کہ دوسرا شخص آزاد کرے؟ قاضی یحیٰی بولے تب جائز ہے اور غلام آزاد ہو جائے گا۔ امام ابو یوسف نے کہا خود آپ نے اپنے قول کی مخالفت کی کیونکہ آپ کے نزدیک

یحیٰی بن سعید سے مناظرہ

ایک شریک کے آزاد کرنے سے آزاد نہیں ہوتا۔ یعنی اس طرح غلام کا غلام باقی رہتا ہے۔ صورت مذکور میں جب ایک شریک نے آزاد کیا تو آپ کے نزدیک اس کا یہ فعل بالکل بے اثر ہے یعنی وہ اسی طرح غلام باقی رہا جیسے پہلے تھا اب صرف دوسرے شریک کے آزاد کرنے سے کیونکر آزاد ہو سکتا ہے۔

قاضی ابی لیلی کے فیصلہ پر نکتہ چینی

محمد بن عبدالرحمٰن جو زیادہ تر ابی الیلی کے لقب سے مشہور تھے فقیہ اور صاحب الرائے تھے ٣٣ برس کوفہ میں منصب قضا پر مامور رہے۔ امام ابو حنیفہ اور ان میں کسی قدر شکر رنجی تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ فیصلوں میں غلطی کرتے تھے تو امام صاحب اس کی اصلاح کرنا چاہتے تھے، یہ ان کو ناگوار معلوم ہوتا تھا۔ لیکن امام صاحب اظہار حق پر مجبور تھے قاضی صاحب مسجد میں بیٹھ کر انفصال مقدمات کیا کرتے تھے۔ ایک دن کام سے فارغ ہو کر مجلس قضا سے اٹھے راہ میں ایک عورت کو دیکھا کہ کسی سے جھگڑ رہی ہے تکرار ہو گئی۔ اثنائے گفتگو میں عورت نے اس شخص کو ابن الزانیتین کہہ دیا یعنی اے زانی اور زانیہ کے بیٹے۔ قاضی صاحب نے حکم دیا کہ عورت گرفتار کر لی جائے۔ پھر مجلس قضا میں واپس آئے اور حکم دیا کہ عورت کو کھڑا کر کے دُرّے لگائے جائیں اور دو حد ماریں امام ابو حنیفہ کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی۔ فرمایا کہ قاضی صاحب نے اس فیصلہ میں چند غلطیاں کیں۔ مجلس قضا سے اٹھ کر واپس آئے اور دوبارہ اجلاس کیا یہ آئین عدالت کے خلاف ہے۔ مسجد میں حد مارنے کا حکم دیا حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے اس سے منع کیا ہے۔ عورت کو بٹھا کر حد مارنی چاہیے قاضی صاحب نے اس کے خلاف کیا۔ ایک لفظ سے ایک ہی حد لازم آتی ہے اور دو حدیں لازم بھی آئیں تو ایک ساتھ دونوں کا نفاذ نہیں ہو سکتا، ایک حد کے بعد مجرم کو چھوڑ دینا چاہیے کہ زخم بالکل بھر جائیں پھر دوسری حد کی تکمیل ہو سکتی ہے۔ جس کو گالی دی گئی اس نے جب دعویٰ نہیں کیا تو قاضی صاحب کو مقدمہ قائم کرنے کا کیا حق حاصل تھا"۔ قاضی ابن ابی الیلی نہایت برہم ہوئے اور گورنر کوفہ سے جا کر

فیصلہ دبا لیا

شکایت کی کہ امام ابو حنیفہؒ نے مجھ کو تنگ کر رکھا ہے۔ گورنر نے حکم بھیجا کہ ابو حنیفہؒ

---

[1] ابن خلکان ترجمہ محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ۔

فتویٰ نہ دینے پائیں۔ امام صاحب اگرچہ حق کے خلاف کسی حاکم یا امیر کی پرواہ نہیں کرتے تھے تاہم چونکہ فتوے دینا فرض کفایہ تھا اور کوفہ میں اور بہت سے علما موجود تھے اس لئے حاکم وقت کی اطاعت کو مقدم رکھا اور بغیر کسی عذر کے حکم کی تعمیل کی۔
ایک دن گھر میں بیٹھے تھے ان کی لڑکی نے فتویٰ پوچھا کہ میں آج روزے سے ہوں دانتوں سے خون نکلا اور تھوک کے ساتھ گلے سے اتر گیا۔ روزہ جاتا رہا یا باقی رہا؟ آپ نے فرمایا کہ جان پدر! اپنے بھائی حماد سے پوچھ میں تو فتویٰ دینے سے منع کر دیا گیا ہوں" مورخ ابن خلکان نے اس روایت کرکے لکھا ہے کہ" اطاعت حکم اور اعانت کی اس سے بڑھ کر کیا مثال ہوسکتی ہے"[1] چند روز کے بعد گورنر کوفہ کو اتفاق سے فقہی مسائل میں مشکلات پیش آئیں اور امام ابو حنیفہؒ کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ جس کی وجہ سے امام صاحب کو پھر فتویٰ دینے کی عام اجازت ہو گئی۔

امام صاحبؒ کے مناظرات میں کہیں کہیں ادّعا اور جوش کا اثر پایا جاتا ہے جو بظاہر ان کی تواضع اور بے نفسی کے خلاف ہے لیکن یہ انسانی جذبات ہیں جن سے کوئی شخص بری نہیں ہوسکتا۔ ہم نے امام شافعیؒ، امام مالکؒ، امام بخاریؒ، امام مسلمؒ اور بڑے بڑے ائمہ کے مناظرات کتابوں میں دیکھے ہیں ان میں اس سے زیادہ ادعا تیزی حوصلہ مندی کا زور پایا جاتا ہے اور یہ سچ ہے کہ اگر اس قسم کی باتیں بزرگوں کے حالات میں مذکور نہ ہوتیں تو ہم کو شبہہ ہوتا کہ تذکرہ نویسوں نے ان بزرگوں کی اصلی تصویر نہیں دکھائی ہے بلکہ اپنی خوش اعتقادی کا خاکہ کھینچا ہے۔ ایک حکیم نے نہایت سچ کہا ہے کسی نامور یا مقتدا کے حالات لکھو تو اس کے وہ خصائل بھی ضرور دکھاؤ جن میں انسانی فطرت کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس سے لوگوں کو اچھے کاموں میں تقلید کی خواہش پیدا ہوگی۔ بخلاف اس کے اگر بالکل فرشتے بنا کر پیش کروگے تو لوگ شاید ان کی پرستش کرنے پر آمادہ ہو جائیں لیکن ان کی ریس کرنے کا خیال ہرگز پیدا نہ ہوگا وہ سمجھیں گے یہ شخص دائرہ انسانی سے باہر تھا۔ ہم انسان ہو کر کیونکر اس کی تقلید کرسکتے ہیں۔

استغفار

ایک دن حسن اتفاق سے امام سفیان ثوری قاضی ابن ابی لیلیٰ شریک امام ابو حنیفہؒ

[1] اس مناظرہ کو خطیب نے تاریخ بغداد میں اور حافظ ابو المحاسن نے عقود الجمان میں کسی قدر اختلاف کے ساتھ نقل کیا

ایک مجلس میں جمع تھے۔ شائقین علم کو اس سے عمدہ کیا موقع مل سکتا تھا۔ ایک شخص نے آکر مسئلہ پوچھا کہ چند آدمی ایک جگہ جمع تھے دفعتاً ایک سانپ نکلا اور شخص کے بدن پر چڑھنے لگا۔ اس نے گھبرا کر پھینک دیا تو وہ دوسرے شخص پر جا گرا۔ اس نے بھی اضطراب میں ایسا ہی کیا۔ یہ سلسلہ یوں ہی ایک دوسرے پر پھینکتے رہے یہاں تک کہ اخیر شخص کو اس نے کاٹا اور وہ مر گیا دیت کس پر لازم آئے گی؟" یہ فقہ کا ایک دقیق مسئلہ تھا سب کو تامل ہوا۔ کسی نے کہا سب کو دیت دینی ہوگی۔ بعضوں نے کہا صرف پہلا شخص ذمہ دار ہوگا۔ سب کے سب مختلف الرائے تھے۔ باوجود بحث کے کچھ تصفیہ نہ ہوتا تھا۔

امام ابو حنیفہ چپ تھے اور مسکراتے جاتے تھے آخر سب نے ان کی طرف خطاب کیا کہ آپ بھی اپنا خیال ظاہر فرمائیے۔ امام صاحب نے کہا جب پہلے شخص نے دوسرے شخص پر پھینکا اور وہ محفوظ رہا تو پہلا شخص بری الذمہ ہو چکا۔ اسی طرح دوسرا اور تیسرا بھی۔ بحث اگر ہے تو صرف اخیر شخص کی نسبت ہے اس کی دو حالتیں اگر اس کے پھینکنے کے ساتھ ہی سانپ نے اس کو کاٹا تو اس پر دیت لازم آئے گی اور اگر کچھ وقفہ ہوا تو یہ شخص بھی بری الذمہ ہو گیا۔ اگر سانپ نے اس شخص کو کاٹا تو اس کی خود غفلت ہے کہ اس نے اپنی حفاظت میں جلدی اور تیز دستی کیوں نہ کی۔" اس رائے سے سب نے اتفاق کیا اور امام کے جودت طبع کی تعریف کی۔

رائے و تدبیر، عقل و فراست، ذہانت و طباعی امام صاحب کے مشہور اوصاف ہیں جن کو موافق و مخالف سب نے تسلیم کیا ہے۔ محمد انصاری کہا کرتے تھے کہ امام ابو حنیفہ رح کی ایک حرکت یہاں تک کہ بات چیت اٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے میں دانشمندی کا اثر پایا جاتا تھا۔ علی بن عاصم کا قول تھا کہ اگر آدھی دنیا کی عقل ایک پلہ میں اور ابو حنیفہ کی عقل دوسرے میں رکھی جاتی تو ابو حنیفہ کا پلہ بھاری رہتا۔ خارجہ بن مصعب کہا کرتے تھے کہ میں کم و بیش ایک ہزار عالموں سے ملا ہوں جن میں عاقل صرف تین چار شخص دیکھے ان ابو حنیفہ تھے۔ ہمارے تذکروں اور رجال کی کتابوں میں علماء کے وہ اوصاف ہیں جن کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا جاتا ہے تیزی ذہن، قوت حافظہ، بے نیازی، تواضع، قناعت

ذہانت و طباعی

زہد و اتقا، غرض اس قسم کے اوصاف ہوتے ہیں لیکن عقل و فراست تدبر کا ذکر تک نہیں
آتا۔ گویہ باتیں دنیاداروں کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اسی بات کو علامہ ابن خلدون نے اس
پیرایہ میں لکھا ہے کہ "علماء کا وہ گروہ انتظام اور ریاست سے بالکل مناسبت نہیں رکھتا
اور یہ بالکل سچ ہے۔ حالانکہ اگر سچ پوچھئے تو علماء میں ان اوصاف کی زیادہ ضرورت ہے۔
اسلام بخلاف اور مذہبوں کے دین کے ساتھ دنیاوی انتظامات کا بھی متکفل ہے۔ خلفائے
اوّلین کے حالات پڑھو سیاست اور انتظام ملکی کے لحاظ سے تمام دنیا کے سلاطین اور
فرمانرواؤں میں کون شخص ان کا ہمسر کہا جاسکتا ہے۔ بے شبہ اس خصوصیت کے اعتبار
سے امام ابوحنیفہ تمام فرقہ علماء میں ممتاز ہیں کہ وہ مذہبی امور کے ساتھ دنیاوی ضرورتوں
کے اندازہ داں تھے۔ یہی بات ہے کہ ان کا باعث سلطنت و حکومت کے ساتھ زیادہ
مناسبت رکھتا ہے۔ اسلام میں سلطنت و حکومت کے جو بڑے بڑے سلسلے قائم ہوئے
مذہباً اکثر حنفی تھے۔

امام ابوحنیفہ اگرچہ شاہی تعلقات سے آزاد رہے لیکن خود ملک کے ساتھ ان کے
جو تعلقات تھے وہ خود ایک ملکی حیثیت رکھتے تھے جن کے فرائض کو انہوں نے اس دانائی اور
ہوشمندی سے انجام دیا جو ایک مدبر سلطنت کے شایاں تھا وہ اپنے ہمعصروں کی طرح اپنے
تلامذہ کو یہ نہیں سکھاتے تھے کہ ضروریات زندگی میں امیروں رئیسوں کی فیاضیوں کا منہ تکتے
رہیں۔ وہ خود کسی کے وصیت نگر نہیں ہوئے اور شاگردوں کو بھی اسی کی تعلیم کی۔ ہم نے ان
کے شاگردوں کی مفصل فہرست دیکھی ہے ان میں اکثر ایسے لوگ ہیں جو حلقہ درس سے اٹھ کر
ملکی عہدوں پر پہنچے اور نہایت دیانت و قابلیت سے اپنی خدمات کو انجام دیا۔ قاضی
ابویوسف صاحبؒ جو ہارون الرشید کے عہد میں محکمہ قضا کے وزیر تھے اور جن کی حسن تدبیر
و انتظام نے اس محکمہ کو اس قدر وسیع با قاعدہ مرتب کر دیا کہ اس سے پہلے کبھی نہیں
ہوا تھا نہ بعد میں۔ اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے یہ امام ابوحنیفہ ہی کی صحبت کا فیض
تھا یہ ضرور ہے کہ ملکی تعلقات کے ساتھ مذہب اور اخلاق کے فرائض کو سنبھالنا نہایت
مشکل ہوتا ہے لیکن امام صاحب اس سے بے خبر نہ تھے وہ ہمیشہ شاگردوں کو ایسی ہدایتیں

تنگی پابندی سے دنیا و دین دونوں حاصل ہوں جو اس آیت کی تفسیر ہے رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً۔ قاضی ابو یوسف کو امام صاحب کی تعلیم نے جو لیاقت ان میں پیدا کر دی تھی ان کے جوہر صاف نظر آتے۔ اسی لحاظ سے امام صاحب نے ان کو کچھ ہدایتیں لکھ کر دیں جو تمام مہمات دینی و دنیوی کے لئے دستور العمل تھیں یہ تحریر کتابوں میں منقول ہے۔ افسوس کہ تطویل کے لحاظ سے ہم اس کو تمام تر نہیں نقل کر سکتے تاہم موقع اور مقام کی رعایت سے اس کا انتخاب دکھانا ضروری ہے۔

قاضی ابو یوسف کے لئے جو ہدایت نامہ لکھا تھا اس کے بعض مقامات

اس تحریر میں پہلے سلطان وقت کے تعلقات کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں

"بادشاہ کے پاس بہت کم آمد و رفت رکھنا۔ اس سے ہر وقت اس طرح پر محفوظ رہنا جیسا انسان آگ سے احتیاط رکھتا ہے، جب تک کوئی خاص ضرورت نہ ہو دربار میں نہ جانا کہ اپنا اعزاز و وقار قائم رہتا ہے اگر اتفاق سے دربار میں ایسے لوگ موجود ہوں جن سے تم کو واقفیت نہ ہو تو اور بھی پرہیز کرنا کیونکہ جب ان کا رتبہ معلوم نہیں تو ممکن ہے مخاطبت اور گفتگو میں ان سے جو برتاؤ کیا جاوے ان کی شان کے مناسب نہ ہو۔ وہ اگر تم سے زیادہ بلند مرتبہ ہیں اور تم نے ان کا لحاظ نہیں کیا تو بے تمیزی سمجھی جائے گی اگر معمولی آدمی ہیں اور تم نے زیادہ تعظیم و تکریم کی تو بادشاہ کی آنکھ میں تمہاری ذلت ہو گی بادشاہ اگر تم کو عہدۂ قضا پر مامور کرنا چاہے تو پہلے دریافت کر لینا کہ وہ تمہارے طریقۂ اجتہاد سے موافق ہیں یا نہیں؟ ایسا نہ ہو کہ سلطنت کے دباؤ سے تم کو اپنی رائے کے خلاف عمل کرنا پڑے۔ جس عہدے اور خدمت کی تم میں قابلیت نہ ہو اس کو ہرگز قبول نہ کرنا" ان ہدایتوں میں اگرچہ بادشاہ کی حرمت و توقیر کی بہت تاکید ہے لیکن اظہار حق کے موقع پر پوری آزادی سے کام لیا ہے۔ چنانچہ اخیر میں لکھتے ہیں کہ "اگر کوئی شخص شریعت میں کسی بدعت کا موجد ہو تو اعلانیہ اس کی غلطی کا اظہار کرنا اور لوگوں کو اس تقلید کی جرأت نہ ہو، اس بات کی کچھ پرواہ نہ کرنا کہ وہ شخص جاہ و شوکت رکھتا ہے کیونکہ اظہار حق میں خدا تمہارا مددگار ہو گا اور وہ اپنے دین کا محافظ و حامی ہے۔ خود بادشاہ سے اگر نامناسب حرکت صادر ہو تو صاف کہ دینا کہ گو میں عہدہ

خدمت کے لحاظ سے آپ کا مطیع ہوں تاہم آپ کو آپ کی غلطی پر مطلع کر دینا میرا فرض ہے۔ پھر بھی نہ ملنے تو تنہائی میں سمجھانا کہ آپ کا یہ فعل قرآن مجید اور احادیث نبوی کے خلاف ہے۔ اگر سمجھ گیا تو خیر ورنہ خدا سے دعا کرتا کہ اس کے شر سے تم کو محفوظ رکھے۔

زندگی کے معمولی کاروبار کے متعلق نہایت عمدہ ہدایتیں کی ہیں۔ چنانچہ تحریر فرماتے ہیں کہ تحصیل علم کو سب پر مقدم رکھنا اس سے فراغت ہو چکے تو جائز طریقوں سے دولت حاصل کرنا۔ کیونکہ ایک وقت میں علم و دولت دونوں کی تحصیل نہیں ہو سکتی پھر نکاح کرنا لیکن اس وقت جب یہ یقین ہو کہ اہل وعیال کی تمام ذمہ داریاں اٹھا سکو گے۔ ایسی عورت سے شادی نہ کرنا جو دوسرے شوہر سے اولاد رکھتی ہو۔ عام آدمیوں اور خصوصاً دولتمندوں سے کم میل جول رکھنا ورنہ ان کو گمان ہوگا کہ تم ان سے توقع رکھتے ہو اور اس خیال سے وہ رشوت دینے پر آمادہ ہوں گے۔ اور بازار میں جانا، دکان پر بیٹھنا، راستے یا مسجد میں کوئی چیز کھا لینی، سقایات یا سقاؤں کے ہاتھ سے پانی پی لینا، ان باتوں سے نہایت احتراز رہے۔ کوئی شخص مسئلہ پوچھے تو صرف سوال کا جواب دو۔ اپنی طرف سے کچھ نہ بڑھاؤ۔ عقائد کے متعلق عوام سے گفتگو نہیں کرنی چاہیئے۔ شاگردوں کے ساتھ ایسے خلوص اور محبت سے پیش آؤ کہ کوئی غیر دیکھے تو سمجھے کہ تمہاری اولاد ہیں۔ عوام اور معمولی رتبے کے لوگ مناظرہ کرنا چاہیں تو احتراز کرو۔ کسی شہر میں جانا ہو تو وہاں کے علماء و فضلاء سے اس طرح ملو کہ ان کو رقابت کا خیال نہ ہو۔ علمی تذکرہ آجائے تو جو بات کہو خوب سوچ سمجھ کر کہو اور وہی کہو جس کا کافی ثبوت دے سکتے ہو۔ مناظرہ کے وقت نہایت جرأت و استقلال سے کام لو، ورنہ اگر دل میں ذرا بھی خوف ہوگا تو خیالات مجتمع نہ رہ سکیں گے اور زبان میں لغزش ہوگی جو لوگ آداب مناظرہ سے واقف نہیں یا مکابرہ کرنا چاہتے ہیں ان سے ہرگز گفتگو نہ کرنی چاہیئے۔ مناظرہ کے وقت غصہ نہ کرنا چاہیئے۔ ہنسنا کم چاہیئے زیادہ ہنسی سے دل افسردہ ہوتا ہے، جو کام کرو اطمینان اور وقار کے ساتھ کرو کوئی شخص جب تک سامنے سے نہ پکارے کبھی جواب نہ دو۔ کیونکہ پیچھے سے پکارنا جانوروں کے لئے مخصوص ہے۔ راستہ چلو تو دائیں بائیں نہ دیکھو، حمام میں جاؤ تو عام آدمیوں کی نسبت زیادہ اجرت دو،

صبح اور دوپہر کے وقت حمام میں نہ جاؤ گفتگو میں سختی نہ ہو، آواز بلند نہ ہونے پائے، کوئی چیز خریدنی ہو تو خود بازار نہ جاؤ بلکہ نوکر کو بھیج کر منگوالو، خانگی کاروبار دیانتدار نوکروں کے ہاتھ میں چھوڑ دینا چاہیئے کہ تم کو اپنے مشاغل کے لئے کافی وقت اور فرصت ہاتھ آئے۔ بادشاہ کے قریب سکونت اختیار کرو تو ہر بات سے بے پروائی اور بے نیازی ظاہر ہو اور فقر کی حالت میں بھی استغنا قائم رہے۔ عام آدمیوں میں بیٹھ کر وعظ نہ کہو کیونکہ ایسے موقع پر واعظ اکثر جھوٹ بولنے پر مجبور ہوتا ہے، شاگردوں میں کسی کو فقہ کے درس کی اجازت دو تو خود بھی اس کی درس گاہ میں شریک ہو کر اس کے متعلق رائے قائم کر سکو۔ وہ اگر غلطی کر جائے تو بتا دو، ورنہ تمہارے چپ رہنے سے لوگوں کا گمان ہو گا کہ اس نے جو کہا صحیح کہا۔ فقہ کے علاوہ اور علوم کی مجلس ہو تو خود نہ جاؤ بلکہ اپنے معتمد دوستوں یا شاگردوں کو بھیجو کہ وہ آکر تم سے پورے حالات بیان کریں" ہر بات میں تقویٰ اور امانت کو پیش نظر رکھو۔ خدا کے ساتھ دل سے وہی معاملہ رکھو جو لوگوں کے سامنے ظاہر کرتے ہو۔ جس وقت اذان کی آواز آئے فوراً نماز کے لئے تیار ہو جاؤ۔ ہر مہینے میں دو چار دن روزے کے لئے مقرر کر لو۔ نماز کے بعد ہر روز کسی قدر وظیفہ پڑھا کرو۔ قرآن کی تلاوت قضا نہ ہونے پائے۔ دنیا پر بہت نہ مائل ہو۔ اکثر قبرستان میں نکل جایا کرو، لہو و لعب سے پرہیز کرو۔ ہمسائے کی کوئی برائی دیکھو تو پردہ پوشی کرو۔ اہل بدعت سے بچتے رہو نماز میں جب تک تم کو لوگ خود امام نہ بنائیں امام نہ بنو۔ جو تم سے ملنے آئیں ان کے سامنے علمی تذکرہ کرو۔ اگر وہ اہل علم ہوں گے تو فائدہ اٹھائیں گے ورنہ کم از کم ان کو تم سے محبت پیدا ہو گی "

عبدالعزیز بن رواد کو خلیفہ نے دربار میں بلایا وہ امام صاحب کے شاگرد تھے مشورہ کے لئے ان کے پاس آئے اور کہا کہ خلیفہ نے طلب کیا ہے میں چاہتا ہوں کہ اس کے سامنے وعظ کہوں مگر کیا کہوں اور کس طریقے سے؟ میں اس میں آپ کی ہدایت چاہتا ہوں۔

امام صاحب نے فرمایا یہ کہنا کہ " اے امیرالمؤمنین! دنیا کے طلب کرنے طلب

کرنے کی تین غرضیں ہو سکتی ہیں۔ عزت، ملک، مال، یہ سب آپ کو حاصل ہیں اب تقویٰ اور عمل صالح بھی اختیار کیجئے کہ دنیا و آخرت دونوں حاصل ہوں ۔"

اس واقعہ پر امام صاحب کے حکیمانہ مقولے بھی سننے اور یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ فرمایا کرتے تھے کہ "جس شخص کو علم نے معاصی اور فواحش سے باز نہ رکھا اُس سے زیادہ زیاں کار کون ہو گا" "جو شخص علم دین میں گفتگو کرے اور اس کو یہ خیال نہ ہو کہ ان باتوں کی باز پرس ہو گی، وہ مذہب اور خود اپنے نفس کی قدر نہیں جانتا" "اگر علماء خدا کے دوست نہیں ہیں تو عالم میں خدا کا کوئی دوست نہیں" "جو شخص قبل از وقت ریاست کی تمنا کرتا ہے ذلیل ہوتا ہے" "جو شخص علم کو دنیا کے لئے سیکھتا ہے علم اس کے دل میں جگہ نہیں پکڑتا" "سب بڑی عبادت ایمان اور سب بڑا گناہ کفر ہے" "پس جو شخص افضل ترین عبادت کا پابند اور بدترین معاصی سے محترز رہے اس کی مغفرت کی بہر حال اُمید کی جا سکتی ہے" "جو شخص حدیث سیکھتا ہے اور اس سے استنباط مسائل نہیں کرتا وہ ایک عطار ہے جس کے پاس دوائیں ہیں لیکن یہ نہیں جانتا کہ کون کس مرض کے لئے" "جو شخص علم کا مذاق نہیں رکھتا اس کے آگے علمی گفتگو کرنی اس کو اذیت دینی ہے" "اپنے دوست (نفس) کے لئے گناہ جمع کرنے اور دشمن (ورثا) کے لئے مال فراہم کرنا کیسی غلطی ہے"

ایک شخص نے پوچھا فقہ کے حاصل کرنے میں کیا چیز معین ہو سکتی ہے؟ امام صاحب نے فرمایا "دلجمعی" اس نے عرض کی دلجمعی کیونکر حاصل ہو؟ ارشاد ہوا کہ تعلقات کم کئے جائیں - پوچھا کہ تعلقات کیونکر کم ہوں؟ جواب دیا کہ انسان ضروری چیزیں لے لے اور غیر ضروری چھوڑ دے ۔"

ایک بار کسی نے سوال کیا کہ حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کی لڑائیوں کی نسبت آپ کیا کہتے ہیں؟ فرمایا کہ قیامت میں جن باتوں کی پرسش ہو گی مجھ کو اس کا ڈر لگا رہتا ہے ان واقعات کو خدا مجھ سے نہ پوچھے گا اس لئے اس پر توجہ کرنے کی چنداں ضرورت نہیں "

اس سے یہ خیال کرنا چاہیئے وہ اس بحث کے متعلق اپنی ذاتی رائے نہیں رکھتے تھے خود

ان کا قول ہے کہ حضرت علیؓ کی نظیر اگر ہمارے سامنے موجود نہ ہوتی تو ہم نہ بتا سکتے کہ باغیوں کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے۔ امام شافعی کا بھی یہی قول ہے۔ البتہ ان باتوں کو اسلام کا ایک ضروری مسئلہ قرار دینا اور اس پر بحثوں کا دفتر تیار کرنا ایک فضول کام ہے اور اسی کی طرف امام صاحب نے اشارہ کیا ہے۔

ایک دفعہ ایک شخص تحصیل علم کی غرض سے امام صاحب کے پاس حاضر ہوا اور سفارشی خط پیش کیا، امام صاحب نے فرمایا "علم میں سعی سفارش کا کام نہیں۔ علماء کا خود فرض ہے کہ ان کو جو کچھ آتا ہو تو دوسروں کو بھی بتائیں۔ علم کے دربار میں خاص و عام کی کوئی تفریق نہیں۔

ایک دن گورنر کوفہ نے کہا آپ ہم سے الگ کیوں رہتے ہیں؟ فرمایا" روٹی کا ایک ٹکڑا اور معمولی کپڑا امن و عافیت سے مل جائے تو اس عیش سے بہتر ہے جس کے بعد ندامت اٹھانی پڑے" اسی مضمون کو ایک شاعر نے نہایت خوبی اور سادگی سے ادا کیا ہے۔ وہ کہتا ہے ؎

دو قرص نان اگر گندم ست یا از جو　　سہ تائے جامہ اگر کہنہ ہست یا خود نو
بہ چار گوشہ دیوار خود بخاطر جمع　　کہ کس نگو ید از ینجا بخیز و آنجا رو
ہزار بار فزوں تر بہ نزد ابن یمین　　ز فر مملکت کیقباد و کے خسرو

امام صاحب کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے۔ لیکن تشبیب و غزل کی حیثیت سے نہیں بلکہ وعظ و پند کے طور پر چنانچہ فرماتے ہیں:-

ومن المروة للفتی　　ما عاش دار فاخرة
فاشکر لذا و تنبھا　　واعمل لدار الآخرة

یعنی انسان جب تک زندہ ہے عزت و آبرو کے لئے اس کو اچھا مکان چاہیئے ایسا مکان نصیب ہو تو شکر کرنا چاہیئے اور عاقبت کے مکان کے لئے کوشش کرنی چاہیئے"

امام صاحب کی ذہانت اور طباعی عموماً ضرب المثل ہے، یہاں تک کہ ان کا اجمالی ذکر بھی کہیں آجاتا ہے تو ساتھ ہی یہ صفت بھی ضرور بیان کی جاتی ہے۔ علامہ عبرفی اخبار

من غیر ہیں ان کا ترجمہ نہایت اختصار کے ساتھ لکھا ہے تاہم اس فقرہ کو نہ چھوڑ سکے کہ کَانَ مِنْ اَذْکِیَاءِ بَنِیْ اٰدَمَ۔ یعنی اولادِ بنی آدم میں جو نہایت ذکی گذرے ہیں امام ابوحنیفہ ان میں شمار کئے جاتے ہیں۔ مشکل سے مشکل مسئلوں میں ان کا ذہن ایسی تیزی سے لڑتا تھا کہ لوگ حیران رہ جاتے تھے اکثر موقعوں پر ان کے ہمعصر جو معلومات کے لحاظ سے ان کے ہمسر تھے موجود ہوتے تھے ان کو اصل مسئلہ بھی معلوم ہوتا تھا لیکن جو واقعہ درپیش ہوتا تھا اس کے مطابق کر کے فوراً جواب دینا امام صاحب ہی کا کام تھا۔

ایک شخص کسی بات پر اپنی بیوی سے ناراض ہوا اور قسم کھا کر کہا جب تک تو مجھ سے نہ بولے گی میں تجھ سے نہ بولوں گا۔ عورت تند مزاج تھی اس نے بھی قسم کھائی اور وہی الفاظ دوہرائے جو شوہر نے کہے تھے۔ اس وقت تو غصّہ میں کچھ نہ سوجھا مگر پھر خیال آیا تو دونوں کو افسوس ہوا۔ شوہر امام سفیان ثوری کے پاس گیا اور صورت واقعہ بیان کی۔ سفیان نے کہا قسم کا کفارہ دینا ہوگا اس سے چارہ نہیں۔" مایوس ہو کر اٹھا اور امام ابوحنیفہ کی خدمت میں حاضر ہوا کہ للّٰہ آپ کوئی تدبیر بتایئے۔ امام صاحب نے فرمایا جاؤ شوق سے باتیں کرو کسی پر کفارہ نہیں ہے۔ امام سفیان ثوری کو معلوم ہوا تو نہایت برہم ہوئے اور امام ابوحنیفہ سے جا کر کہا۔ آپ لوگوں کو غلط مسئلے بتا دیتے ہیں۔ امام صاحب نے اس شخص کو بلا بھیجا اور کہا کہ تم دوبارہ صورت واقعہ بیان کرو۔

اس نے اعادہ کیا۔ امام صاحب سفیان کی طرف مخاطب ہوئے اور کہا میں جو پہلے کہتا تھا وہی اب بھی کہتا ہوں۔ سفیان نے کہا کیوں؟ فرمایا جب عورت نے شوہر کو مخاطب کر کے وہ الفاظ کہے تو عورت کی طرف سے بولنے کی ابتدا ہو چکی پھر قسم کہاں باقی رہی۔ سفیان نے کہا حقیقت میں جو بات آپ کو وقت پر سوجھ جاتی ہے ہم لوگوں کو وہاں تک خیال بھی نہیں پہنچتا۔

کوفہ میں ایک شخص نے بڑی دھوم دھام سے ایک ساتھ دو بیٹوں کی شادی کی۔ دعوت میں شہر کے تمام اعیان و اکابر کو مدعو کیا۔ مسعر بن کدام، حسن بن صالح، سفیان ثوری امام ابوحنیفہ شریک دعوت تھے۔ لوگ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے کہ دفعتاً صاحب خانہ

بدحواس گھر سے نکلا اور کہا غضب ہو گیا۔ لوگوں نے کہا خیر ہے؟ بولا کہ زفاف کی رات عورتوں کی غلطی سے شوہر اور بیبیاں بدل گئیں جو لڑکی جس کے پاس رہی وہ اس کا شوہر نہ تھا، اب کیا کیا جائے؟ سفیان نے کہا امیر معاویہ کے زمانے میں بھی ایسا ہی اتفاق ہوا تھا اس سے نکاح میں کچھ فرق نہیں آتا، البتہ دونوں کو مہر دینا لازم ہو گا۔ مسعر بن کدام امام ابو حنیفہ کی طرف مخاطب ہوئے کہ آپ کی کیا رائے ہے؟ امام صاحب نے کہا کہ شوہر خود میرے سامنے آئیں تو جواب دوں۔ لوگ جا کر بلا لائے۔ امام صاحب نے دونوں سے الگ الگ پوچھا کہ رات کو جو عورت تمہارے ساتھ رہی وہی تمہارے نکاح میں رہے تو تم کو پسند ہے؟ دونوں نے کہا ہاں " امام صاحب نے کہا کہ تم اپنی بیبیوں کو جن سے تمہارا نکاح ہوا تھا طلاق دیدو اور ہر شخص اس عورت سے نکاح پڑھائے جو اس کے ساتھ ہم بستر رہ چکی " سفیان نے جواب دیا اگرچہ فقہ کی رُو سے وہ بھی صحیح تھا کیونکہ یہ صورت وطی بالشبہ کی ہے جس سے نکاح نہیں ٹوٹتا لیکن امام صاحب نے مصلحت کو پیش نظر رکھا۔ وہ جانتے تھے کہ موجودہ صورت میں نکاح قائم رہنا غیرت و حمیت کے خلاف ہو گا۔ کسی مجبوری سے زوجین نے تسلیم بھی کر لیا تو دونوں میں وہ خلوص و اتحاد پیدا نہ ہو گا جو تزویج کا مقصد اصلی ہے۔ اس کے ساتھ مہر کی بھی تخفیف ہے کیونکہ خلوت صحیحہ سے پہلے طلاق دی جائے تو صرف آدھا مہر لازم آتا ہے۔

لیث بن سعد جو مصر کے مشہور امام تھے ان کا بیان ہے کہ میں ابو حنیفہ رح کا ذکر اکثر سنا کرتا تھا اور ان کے دیکھنے کا نہایت مشتاق تھا، حج کی تقریب سے مکہ معظمہ جانا ہوا، اتفاق سے ایک مجلس میں پہنچا دیکھا تو بڑا ہجوم ہے۔ ایک شخص صدر کی جانب بیٹھا ہے، لوگ اس سے مسئلے پوچھ رہے ہیں۔ ایک شخص نے بڑھ کر کہا " یا ابا حنیفہ رح!" (یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے ان کو پہچانا) امام ابو حنیفہ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس نے کہا میرا ایک بدمزاج بیٹا ہے اس کی شادی کر دیتا ہوں تو بیوی کو طلاق دے دیتا ہے، لونڈی خریدتا

لہ اس واقعہ کو امام رازی نے تفسیر کبیر میں نقل کیا ہے۔

ہوں تو آزاد کر دیتا ہے۔ فرمائیے کیا تدبیر کروں؟ امام ابو حنیفہ نے برجستہ کہا کہ تم اس کو ساتھ لے جا کر جہاں لونڈیاں بکتی ہیں جاؤ اور جو لونڈی پسند آئے خرید کر اس کا نکاح پڑھا دو۔ اب اگر وہ آزاد کرے گا تو نہیں کر سکتا کیونکہ لونڈی اس کی ملک نہیں۔ طلاق دے گا تو تمہارا کچھ نقصان نہیں۔ تمہاری لونڈی کہیں نہیں گئی" سعد کہتے ہیں مجھ کو جواب پر تو کم لیکن حاضر جوابی پر بہت تعجب ہوا۔ ربیع جو خلیفہ منصور کا عرض بیگی تھا امام ابو حنیفہ سے عداوت رکھتا تھا ایک دن امام صاحب حسب دستور دربار میں گئے، ربیع بھی حاضر تھا۔ منصور سے کہا حضور! یہ شخص امیر المومنین کے جد بزرگوار (عبداللہ بن عباسؓ) کی مخالفت کرتا ہے ان کا قول ہے کہ اگر کوئی شخص کسی بات پر قسم کھائے اور وہ ایک روز کے بعد انشاء اللہ کہہ لے تو وہ قسم میں داخل سمجھا جائے گا۔ ابو حنیفہ اس کے خلاف فتوی دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انشاء اللہ کا لفظ قسم کے ساتھ ہو تو البتہ جزو قسم سمجھا جائے گا ورنہ لغو اور بے اثر ہے" امام صاحب نے کہا امیر المومنین! ربیع کا خیال ہے کہ لوگوں پر آپ کی بیعت کا کچھ اثر نہیں۔ منصور نے کہا یہ کیوں کر؟ امام نے کہا ان کا گمان ہے کہ دربار میں جو لوگ آپ کے ہاتھ پر بیعت خلافت کیا کرتے ہیں اور قسم کھاتے ہیں گھر پر جا کر انشاء اللہ کہہ لیا کرتے ہیں جس سے قسم بے اثر ہو جاتی ہے اور ان پر شرعاً کچھ مواخذہ نہیں رہتا۔ منصور ہنس پڑا اور ربیع سے کہا کہ تم ابو حنیفہ کو چھیڑو، ان پر تمہارا داؤں نہیں چل سکتا"

امام صاحب دربار سے نکلے تو ربیع نے کہا آج تو آپ نے میری جان ہی لے چکے تھے۔ فرمایا "یہ تو تمہارا ارادہ تھا میں نے تو صرف مدافعت کی"

ایک دفعہ بہت سے خارجی امام کے گھر پر چڑھ آئے اور کہا کفر سے توبہ کرو۔ امام صاحب نے کہا ہاں میں تمہارے کفر سے توبہ کرتا ہوں"

خارجیوں کا اعتقاد ہے کہ گناہ کرنے سے انسان کافر ہو جاتا ہے۔ امام صاحب کا مطلب یہ تھا کہ جس چیز کو تم کفر سمجھتے ہو میں اس سے توبہ کرتا ہوں۔ کسی نے ان خارجیوں سے جا لگایا کہ ابو حنیفہ نے تم لوگوں کو دھوکا دیا۔ ان کا مطلب اور تھا۔ خارجیوں نے امام صاحب کو پکڑا کہ تم نے تاویل کیوں کی؟ امام صاحب نے کہا تم کو یقین ہے یا محض گمان کی بنا پر میری نسبت ایسا خیال کرتے ہو؟ بولے کہ نہیں گمان ہی گمان ہے۔ امام نے کہا تم کو خود توبہ کرنی چاہیے کیونکہ خدا فرماتا ہے اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ۔ ایک دن مسجد میں تشریف رکھتے تھے۔ شاگردوں کا مجمع تھا۔ دفعتاً خارجیوں کا ایک گروہ مسجد میں گھس آیا۔ لوگ بھاگ چلے۔ امام صاحب نے روکا اور تسلی دی کہ ڈرو نہیں اطمینان سے بیٹھ جاؤ۔ ایک خارجی جو سب کا سردار تھا امام صاحب کے پاس آیا اور کہا تم کون لوگ ہو؟ امام صاحب نے کہا مستجیر ہیں اور خدا نے فرمایا ہے وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ط یعنی مشرکین میں سے اگر کوئی پناہ مانگے تو اسے پناہ دو تاکہ وہ خدا کا کلام سنے پھر اس کو اس کے امن تک پہنچا دو۔ خارجی اپنے سوا مسلمانوں کے تمام فرقوں کو مشرک اور کافر سمجھتے ہیں اور واجب القتل جانتے ہیں۔ اس موقع پر وہ اس نیت سے آئے تھے کہ امام ابو حنیفہ اپنا عقیدہ بیان کریں تو کفر کا الزام لگا کر اس قتل کر دیں۔ لیکن امام صاحب کے الزامی جواب نے ان کو بالکل مجبور کر دیا۔ چنانچہ ان کے سردار نے ساتھیوں سے کہا ان کو قرآن پڑھ کر سناؤ اور ان گھر ان کو پہنچا آؤ۔

ابو العباس جو منصور کے دربار میں ایک خاص درجہ رکھتا امام صاحب کا دشمن تھا اور ہمیشہ ان کو ضرر پہنچانے کی فکر میں رہتا تھا۔ ایک دن امام صاحب کسی ضرورت سے دربار میں گئے۔ اتفاق سے ابو العباس

بھی حاضر تھا۔ لوگوں سے کہا آج ابوحنیفہ میرے ہاتھ سے بچ کے نہیں جا سکتے۔ امام صاحب مخاطب ہوا اور کہا ابوحنیفہ امیر المومنین کبھی کبھی ہم لوگوں کو بلا کر حکم دیتے ہیں کہ اس شخص کی گردن مارو۔ ہم کو مطلق معلوم نہیں ہوتا کہ وہ شخص واقعی مجرم ہے یا نہیں۔ ایسی حالت میں ہم کو اس حکم کی تعمیل کرنی چاہیئے یا انکار کرنا چاہیئے۔؟ امام صاحب نے کہا تمہارے نزدیک خلیفہ کے احکام حق ہوتے ہیں یا باطل؟ منصور کے سامنے کس کی تاب تھی کہ احکام خلافت کی نسبت ناجائز ہونے کا احتمال ظاہر کر سکتا۔ ابو العباس کو مجبوراً کہنا پڑا کہ حق ہوتے ہیں۔ امام صاحب نے فرمایا پھر حق کی تعمیل میں پوچھنا کیا۔

ایک شخص نے قسم کھائی کہ آج اگر میں غسل جنابت کروں تو میری بیوی کو تین طلاق ہے۔ پھر تھوڑی دیر بعد کہا آج کوئی نماز قضا ہو تو میری زوجہ مطلقہ ہے۔ پھر کہا کہ اگر آج میں اپنی بیوی کے ساتھ صحبت نہ کروں تو اس کو طلاق ہے" لوگوں نے اماحب سے آکر مسئلہ پوچھا۔ امام صاحب نے فرمایا کہ نماز عصر کو پڑھ کر بیوی سے ہم صحبت ہو اور غروب کے بعد فوراً غسل کر کے مغرب کی نماز پڑھ لے اس صورت میں سب شرطیں پوری ہو گئیں۔ بیوی سے ہم صحبت بھی ہو گیا نماز بھی قضا نہیں کی، غسل جنابت تو اس وقت کیا کہ دن گذر گیا تھا۔

ایک دفعہ ایک شخص امام صاحب کے پاس آیا اور کہا کہ" میں نے کچھ روپے ایک جگہ احتیاط کے ساتھ رکھ دیئے تھے اب یاد نہیں آتا کہاں رکھے تھے۔ مجھ کو سخت ضرورت درپیش ہے کوئی تدبیر بتائیے۔ امام نے فرمایا بھائی! یہ مسئلہ تو فقہ میں مذکور نہیں مجھ سے کیا پوچھنے آئے ہو؟ اس نے زیادہ لجاجت کی تو کہا کہ" آج ساری رات نماز پڑھو" اس نے جا کر نماز پڑھنی شروع کی۔ اتفاق یہ کہ تھوڑی دیر بعد اس کو یاد آ گیا کہ روپے فلاں جگہ رکھے تھے۔ دوڑا ہوا امام صاحب کے پاس آیا اور عرض کی کہ آپ کی تدبیر راست آئی۔ فرمایا کہ" ہاں شیطان

کب گوارا کرتا کہ تم رات بھر نماز پڑھتے رہو۔ اس لئے اس نے جلد یاد دلا دیا۔ تاہم تم کو مناسب تھا کہ اس کے شکریہ میں شب بیداری کرتے اور نمازیں پڑھتے۔

ایک اور دن ایک شخص نے آکر کہا کہ "میں نے کچھ اسباب گھر کے کسی کونے میں گاڑ دیا تھا اب یاد نہیں آتا کہ کہاں گاڑا تھا۔ کیا کروں؟ امام صاحب نے کہا:- تم کو یاد نہیں تو مجھ کو اور بھی یاد نہ ہونا چاہیئے۔" وہ رونے لگا امام صاحب کو رحم آیا چند شاگرد ساتھ لئے اور اس کے گھر پر گئے۔ شاگردوں سے کہا کہ یہ اگر تمہارا گھر ہوتا اور تم حفاظت کے لئے کوئی چیز چھپا کر رکھتے تو کہاں رکھتے۔" سب نے اپنے اپنے قیاس سے مختلف موقع بتائے۔ امام صاحب نے فرمایا کہ انھیں تین چار جگہوں میں سے کہیں نہ کہیں گاڑا ہو گا۔ ان کے کھدوانے کا حکم دیا۔ خدا کی شان تیسری جگہ کھودی تو اسباب بجنسہ مدفون ملا۔ امام صاحب اگرچہ نہایت ثقہ، متین، باوقار تھے۔ تاہم ظرافت کی شوخیاں کبھی کبھی ظرافت کا رنگ دکھاتی تھیں۔ ایک دن اصلاح بنوا رہے تھے۔ حجام سے کہا کہ "سفید بالوں کو چن لینا"۔ اس نے عرض کی کہ جو بال چنے جاتے ہیں اور زیادہ نکلتے ہیں۔ امام صاحب نے کہا "یہ قاعدہ ہے تو سیاہ بالوں کو چن لو اور زیادہ نکلیں۔" قاضی شریک نے یہ حکایت سنی تو کہا کہ ابوحنیفہ نے حجام کے ساتھ بھی قیاس کو نہ چھوڑا۔"

امام صاحب کے محلے میں ایک پنہار رہتا تھا جو نہایت متعصب شیعہ تھا۔ اس کے پاس دو خچر تھے۔ تعصب سے ایک کا نام ابوبکرؓ اور دوسرے کا نام عمرؓ رکھا تھا اتفاق سے ایک خچر نے لات ماری کہ اس کا سر پھٹ گیا اور اسی صدمہ سے مر گیا محلے میں اس کا چرچا ہوا۔ امام صاحب نے سنا تو کہا کہ دیکھنا اس خچر نے مارا ہو گا جس کا نام اس نے عمر رکھا تھا۔ لوگوں نے دریافت کیا تو واقعی ایسا ہوا تھا۔

کوفہ میں ایک غالی شیعی تھا جو حضرت عثمانؓ کی نسبت کہا کرتا تھا کہ "یہودی

تھے" امام صاحب ایک دن اس کے پاس گئے اور کہا کہ تم اپنی بیٹی کی نسبت ڈھونڈھتے تھے ایک شخص موجود ہے جو شریف بھی ہے اور دولتمند بھی ہے اس کے ساتھ پرہیزگار قائم اللیل حافظ قرآن ہے۔ شیعی نے کہا اس سے بڑھ کر کون ملے گا ضرور آپ شادی ٹھہرا دیجئے۔ امام صاحب نے کہا صرف اتنی بات ہے کہ مذہباً یہودی ہے" وہ نہایت برہم ہوا اور کہا "سبحان اللہ! آپ یہودی سے رشتہ داری کرنے کی رائے دیتے ہیں" امام صاحب نے فرمایا کیا ہوا خود پیغمبر خدا نے یہودی کو (تمہارے اعتقاد کے موافق) داماد بنایا تو تم کو کیا عذر ہے۔ خدا کی قدرت اتنی سی بات سے اس کو تنبیہہ ہوگئی اور اپنے عقیدہ سے توبہ کی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حصہ دوم

امام صاحب رح کی تصنیفات

امام صاحب کی طرف جو کتابیں منسوب ہیں ان کے نام یہ ہیں : ۔ فقہ اکبر[1]، العالم والمتعلم[2]، مسند[3] ۔ فقہ اکبر عقائد کا ایک مختصر رسالہ ہے ۔ مسائل اور ترتیب قریب وہی ہے جو عقائد نسفی وغیرہ کی ہے ۔ یہ رسالہ چھپ گیا ہے اور ہر جگہ مل سکتا ہے ۔ لوگوں نے اس پر شرحیں بھی لکھی ہیں ۔ مثلاً محی الدین محمد بہار الدین المتوفی ۹۵۳ھ مولی الیاس بن ابراہیم السنیوبی ۔ مولی احمد بن محمد بن المغنساوی ۔ حکیم اسحاق ۔ شیخ اکمل الدین ملا علی القاری ۔ ملا علی القاری کی شرح متداول ہے ۔ بعض اور شرحوں کے نسخے بھی جا بجا پائے جاتے ہیں ۔ حکیم اسحاق کی شرح کو ابو البقاء احمدی نے ۱۹۱۸ء میں نظم کیا اور اصل کتاب کو ابراہیم بن حسام نے جو شریفی کے نام سے مشہور ہیں ۔

فقہ اکبر

العالم والمتعلم سوال و جواب کے طور پر ایک مختصر رسالہ ہے لیکن ہماری نظر سے نہیں گزرا ۔

العالم والمتعلم

مسند کے متعدد نسخے ہیں جن کو ابو المؤید محمد بن محمود الخوارزمی المتوفی ۶۶۵ھ نے یکجا جمع کر دیا ہے ۔ دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ میں نے بلاد شام میں بعض جاہلوں کو میں نے یہ کہتے سنا کہ امام ابو حنیفہ کو فن حدیث میں کچھ دخل نہ تھا اور اسی وجہ سے حدیث میں ان کی کوئی کتاب نہیں ہے ۔ اس پر مجھ کو حمیت مذہبی کا جوش ہوا اور میں نے چاہا کہ ان تمام مسندوں کو یکجا جمع کر دوں جو علماء نے ابو حنیفہ کی حدیثوں سے مرتب کئے ہیں ۔ اور جن کی تفصیل حسب ذیل ہے ۔ (۱) مسند حافظ ابو محمد عبد اللہ

مسند

بن محمد یعقوب الحارثی البخاری المعروف بعبداللہ الاستاد (۲) مسند امام ابوالقاسم طلحہ بن محمد بن جعفر الشاہد (۳) مسند ابوالحسن محمد بن المظفر بن موسیٰ بن عیسیٰ (۴) مسند حافظ ابوالقیم الاصفہانی (۵) مسند شیخ ابوبکر محمد بن الباقی محمد الانصاری (۶) مسند امام ابواحمد عبداللہ بن عدی الجرجانی (۷) مسند امام حافظ عمر بن حسن الاشنانی (۸) ابوبکر احمد بن محمد خالد الکلاعی (۹) مسند امام ابویوسف قاضی (۱۰) مسند امام محمد (۱۱) مسند حماد ابن امام ابوحنیفہ (۱۲) آثار امام محمد (۱۳) مسند امام ابوالقاسم عبداللہ بن العوام العدی۔ ابوالمؤید الخوارزمی نے جن مسندوں کے نام لئے ہیں ان کے سوا اور بھی مسانید ہیں۔ مثلاً حافظ ابوعبداللہ حسین بن محمد بن خسرو البلخی المتوفی ۵۲۳ھ مسند حنفکی۔ جس کی شارح ملا علی قاری نے لکھی۔ مسند داوردی۔ مسند ابن البزازی المتوفی المتوفی ۸۲۷ھ ان مسندوں کی شرحیں بھی لکھی گئی ہیں۔

جو لوگ امام صاحب کے سلسلہ کمالات میں تصنیف و تالیف کا وجود بھی ضروری سمجھتے ہیں، وہ انہیں مفصلہ بالا کتابوں کو شہادت میں پیش کرتے ہیں۔ لیکن انصاف یہ ہے کہ ان تصنیفات کو امام صاحب کی طرف منسوب کرنا نہایت مشکل ہے۔ اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ امام صاحب کی زندگی میں ایک مجموعۂ فقہ مرتب ہوگیا تھا جس کے حوالے عقود الجمان وغیرہ میں جابجا ملتے ہیں۔ لیکن قیاس غالب یہ ہے کہ وہ نسخہ معدوم ہوگیا۔ اس زمانہ کی ہزاروں تصنیفات کے نام تراجم کی کتابوں میں مذکور ہیں لیکن دو تین کے سوا ایک بھی دنیا کے کسی کتب خانہ میں پتہ نہیں چلتا۔ خود امام صاحب کے ہمعصروں میں سے سفیان ثوری، امام اوزاعی، حماد بن سلمہ، ہشیم، حریر بن عبدالحمید، عبداللہ بن المبارک نے حدیث و فقہ میں بڑی بڑی کتابیں لکھیں لیکن آج ان کا نام ہی نام رہ گیا ہے اور ایک کا بھی وجود نہیں۔ امام رازی نے مناقب الشافعی میں تصریح کی ہے کہ امام ابوحنیفہ کی کوئی تصنیف باقی نہیں رہی۔

مسند خوارزمی کو امام صاحب کا مسند کہنا مجازی اطلاق ہے خوارزمی خود ساتویں صدی میں تھے۔ جن مسندوں کو جمع کیا ہے وہ بھی اکثر تیسری چوتھی

صدی یا اس کے بعد کی ہیں۔ حماد، قاضی ابو یوسف البتہ امام صاحب کے ہمعصر ہیں اور ان کا مسند بے شبہہ امام ابوحنیفہ کا مسند کہا جا سکتا ہے۔ لیکن خوارزمی کے سوا اور کسی نے ان مسندوں کا نام نہیں لیا ہے، حالانکہ حدیث کی کتاب جب تک مشہور اور مستند روایتوں سے نہ ثابت ہو اس کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا، ہمارے نزدیک اس بحث میں شاہ ولی اللہ صاحب کا فیصلہ کافی ہے۔ وہ حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں کہ طبقہ رابعہ کی وہ کتابیں ہیں جن کے مصنفوں نے ایک مدت دراز کے بعد ان روایتوں کو جمع کرنا جو پہلے طبقوں میں موجود نہ تھی اور گمنام مسندوں اور مجموعوں میں پائی جاتی تھیں۔ ان لوگوں نے ان کو بلند نام کرنا چاہا۔ حالانکہ وہ حدیثیں لوگوں کی زبانوں پر تھیں جن کا محدثین اعتبار نہیں کرتے۔ مثلاً زیادہ گو واعظین اور اور اہل بدعت اور ضعیف الروایۃ یا وہ صحابہ اور تابعین کے آثار یا بنی اسرائیل کے قصے تھے یا حکماء اور واعظین کے مقولے تھے جن کو راویوں نے رسول اللہ کے کلام سے مخلوط کر دیا تھا یا قرآن و حدیث کے نقل مضامین تھے جن کو ان نیک آدمیوں نے بالمعنی روایت کیا جو فن روایت کی باریکیوں سے ناواقف تھے۔ ان لوگوں نے ان باتوں کو رسول اللہ کی طرف منسوب کر دیا، یا ایسے مضامین تھے جو قرآن اور حدیث سے مستنبط ہوتے تھے ان کو قصداً حدیث نبوی بنا دیا، یا مختلف حدیثوں کے ٹکڑے تھے جو ایک عبارت میں مرتب کر دیے گئے ہیں۔ اس قسم کی حدیثیں کتاب الضعفاء ابن حبان کامل ابن عدی تصنیفات خطیب ابو نعیم و جوزقانی و ابن عساکر ابن نجار و دیلمی میں مل سکتی ہے۔ مسند خوارزمی بھی اسی طبقہ میں داخل ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب ذرا سختی کی بات اتنی کی ہے کہ جن مسندوں کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ امام صاحب کے شاگردوں نے لکھے ان کا نہ تاریخوں سے ثبوت ملتا ہے نہ وہ خود کہیں پائے جاتے ہیں جو مسند امام صاحب کے زمانہ سے بہت پیچھے لکھے گئے وہ البتہ موجود ہیں۔ لیکن ان کی حدیثوں کا امام صاحب تک

بسند صحیح متصل پہنچنا نہایت مشتبہ ہے ۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ بعض بعض مسانید میں بے اعتباری کی اندرونی شہادتیں موجود ہیں ۔ مسند حصفکی میں کئی روایتیں امام صاحب کی طرف منسوب ہیں جن کو انھوں نے خود صحابہ سے سنا اور روایت کیا ہے ۔ حالانکہ امام صاحب کا صحابہ سے روایت کرنا محدثانہ تحقیقات کی رو سے ہرگز ثابت نہیں ہوسکتا ۔ خوارزمی نے آثار محمد کو بھی امام کی مسانید میں داخل کیا ہے ۔ بے شبہہ اس کتاب میں اکثر روایتیں امام صاحب ہی سے ہیں اس لئے ناظرین کو اختیار ہے کہ اس کو امام صاحب کا مسند کہیں یا آثار محمد کے نام سے پکاریں ۔ لیکن یاد رہے کہ امام محمد نے اس کتاب میں بہت آثار اور حدیثیں دوسرے شیوخ سے بھی روایت کی ہیں اس لحاظ سے اس مجموعہ کا انتساب امام محمد کی طرف زیادہ موزوں ہے ۔

فقہ اکبر کو اگرچہ فخر الاسلام بزودی عبد العلی بحر العلوم و شارحین فقہ اکبر نے امام صاحب کی طرف منسوب کیا ہے ۔ لیکن ہم مشکل سے اس بات پر یقین کرسکتے ہیں ۔ یہ کتاب جس زمانہ کی تصنیف بیان کی جاتی ہے اس وقت تک یہ طرز پیدا نہیں ہوا تھا ۔ وہ بطور ایک متن کے ہے اور اسی اختصار و ترتیب کے ساتھ لکھی گئی ہے جو متاخرین کا خاص انداز ہے ۔ ایک جگہ اس میں جوہر و عرض کا لفظ آیا ہے حالانکہ یہ فلسفیانہ الفاظ اس وقت تک زبان میں داخل نہیں ہوئے تھے ۔ بے شبہہ منصور عباسی کے زمانہ میں فلسفہ کی کتابیں یونانی زبان سے عربی میں ترجمہ کی گئیں تھیں ۔ لیکن یہ زمانہ امام صاحب کی آخری زندگی کا زمانہ ہے ۔ کسی طرح قیاس نہیں کیا جاسکتا کہ ترجمہ ہوتے ہی یہ الفاظ اس قدر جلد شائع ہو جائیں کہ عام تصنیفات میں ان کا رواج ہو جائے ۔ فلسفہ کے الفاظ نے مذہبی دائرہ میں اس وقت بار پایا ہے جب کثرت استعمال کی وجہ سے زبان کا جز بن گئے اور عام بول چال میں بھی ان کے استعمال کے بغیر چارہ نہ رہا ۔ لیکن یہ دور امام صاحب کے زمانے کے بعد شروع ہوا ہے ۔

یہ بحث تو روایت کی حیثیت سے تھی اصول روایت کے لحاظ سے بھی یہ امر ثابت نہیں ہوتا۔ دوسری تیسری بلکہ چوتھی صدی کی تصنیفات میں اس کتاب کا پتہ نہیں چلتا۔ قدیم سے قدیم تصنیف جس میں اس رسالہ کا ذکر کیا گیا ہے (جہاں تک ہم کو معلوم ہے) فخرالاسلام بزدوی کی کتاب الاصول ہے جو پانچویں صدی کی تصنیف ہے۔ امام ابوحنیفہ کے ہزاروں شاگرد تھے جن میں سے اکثر بجائے خود استاد تھے اور بواسطہ در واسطہ ان کے ہزاروں لاکھوں شاگرد ہوئے بہت خلاف قیاس ہے کہ امام صاحب کی تصنیف موجود ہوتی اور اتنے بڑے گروہ میں اس کا نام تک نہ لیا جاتا، علم عقائد اور اس کے متعلقات پر بڑی بڑی کتابیں مثلاً صحائف، شرح مقاصد، شرح مواقف، ملل و نحل وغیرہ تصنیف ہوئیں ان میں کہیں ان کا ذکر تک نہیں ہے۔ اس کتاب کی جس قدر شرحیں ہوتیں سب آٹھویں صدی میں اور اس کے بعد ہوئیں۔ اس کے علاوہ ابومطیع جو اس کتاب کے راوی ہیں حدیث و روایت میں چنداں مستند نہیں ہیں۔ کتب رجال میں ان کی نسبت محدثین نے نہایت سخت ریمارک کئے ہیں اگرچہ میں ان کو کلیۃً تسلیم نہیں کرتا تاہم ایک ایسی مشتبہ کتاب جس کا ثبوت صرف ابومطیع بلخی کی روایت پر منحصر ہو محدثانہ اصول پر قابل تسلیم نہیں ہو سکتی۔

میرا خیال ہے کہ ابومطیع بلخی نے ایک رسالہ میں بطور خود عقائد کے مسائل کے قلم بند کئے تھے رفتہ رفتہ وہ امام صاحب کی طرف منسوب ہو گیا اس خیال کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ علامہ ذہبی نے عبر فی اخبار من غبر میں ابومطیع کا جہاں ذکر کیا ہے ان لفظوں سے کیا ہے کہ صاحب الفقہ الاکبر جس کے متبادر معنی یہی ہیں کہ خود ابومطیع اس کے مصنف ہیں۔ میرا خیال یہ بھی ہے کہ فقہ اکبر کی موجودہ ترتیب و عبارت ابومطیع کے زمانے سے بہت بعد کی ہے اور یہ کچھ نئی بات نہیں جامع صغیر جو امام محمد کی تالیف ہے اس کی موجودہ ترتیب امام ابوالطاہر دباس نے کی ہے جو چوتھی صدی میں تھے۔ فرق یہ ہے کہ جامع صغیر وہی اصلی ہے صرف ترتیب بدل دی

گئی ہے برخلاف اس کے فقہ اکبر کا انداز عبارت بھی زمانہ بعد کا معلوم ہوتا ہے۔
ہم نے اس بحث میں اپنی رائے اور قیاسات کو بہت دخل دیا ہے۔ لیکن تمام واقعات بھی لکھ دیئے ہیں۔ ناظرین کو ہم اپنی رائے کے قبول کرنے پر مجبور نہیں کرتے اصل واقعات اور ہماری رائیں دونوں ان کے سامنے ہیں وہ چاہیں خود فیصلہ کریں۔ بے شبہہ ہماری خالی رائے یہی ہے کہ آج امام صاحب کی کوئی تصنیف موجود نہیں ہے۔

عقائد و کلام

امام صاحب ابتدائی تحصیل میں علم کلام کی طرف زیادہ مائل تھے۔ صحابہ کے اخیر زمانے میں نئے نئے فرقے پیدا ہو چلے تھے۔ معبد جہنی نے جو صحابہ کا صحبت یافتہ تھا مسئلہ قدر کو چھیڑا۔ واصل بن عطار نے جو علوم عربیہ و علم کلام کا بہت بڑا عالم اور امام حسن بصریؒ کا شاگرد تھا اعتزال کی بنیاد قائم کی۔

جہیم بن صفوان فرقہ جہمیہ کا بانی ہوا۔ خوارج کے متعدد فرقے اس سے پہلے پیدا ہو چکے تھے۔ امام ابوحنیفہ کے زمانہ میں ان مسائل کے جابجا چرچے تھے اور ہر جگہ بحث و مناظرہ کا بازار گرم تھا امام صاحب کو بھی ان کی ردّ و قدح کی طرف التفات ہوا اس میں شک نہیں کہ ان کی بے نظیر ذہانت سے ان مسائل میں نہایت دقیق بحثیں پیدا ہوئی ہوں گی۔ لیکن چونکہ یہ شغل تھوڑے زمانہ تک رہا اور بالآخر وہ فقہ کے مہمات میں مصروف ہو گئے اس لئے ان مباحث کا آج پتہ نہیں چلتا۔ چنانچہ چند چند مسائل جو بتواتر ان کی طرف منسوب ہیں ان کی وقعت نظر، جدت ذہن، وسعت خیال کے شاہد عادل ہیں ان میں سے بعض مسائل کا ہم ذکر کرتے ہیں جو محدثین کے نزدیک بڑے معرکۃ الآرا مسئلے ہیں۔ پہلا مسئلہ یہ ہے کہ امام صاحب فرائض اور اعمال کو جزو ایمان نہیں سمجھتے آج تو اس کی نسبت بحث کرنی گویا تحصیل حاصل ہے۔ ایک معمولی آدمی سمجھ سکتا ہے کہ ایمان اعتقاد کا نام ہے جو دل سے متعلق ہے فرائض

اعمال و ایمان یا ہیں

اور اعمال جوارح کے کام ہیں اس لئے اِن دونوں سے کوئی حقیقت مرکب ہو سکتی ہے نہ اِن میں سے ایک دوسرے کا جزو ہو سکتا ہے۔ لیکن اس زمانہ میں یہ ایک بڑا بحث طلب مسئلہ تھا اور اکثر ارباب ظاہر بلکہ بعض مجتہدین بھی اس کے خلاف تھے۔

صحابہ کے زمانہ تک اسلامی عقائد کی سطح نہایت ہموار اور غیر متحرک رہی اہل عرب کو ان موشگافیوں اور باریک بینیوں سے سروکار نہ تھا۔ بنو امیہ کے وسط زمانہ میں جب فوجی قوت کو زوال ہوا تو تمدن و معاشرت کی وسعت نے اور قسم کے اشغال پیدا کر دیئے۔ جبر و قدر، تشبیہ و تنزیہ، عدل و جور کی بحثیں چھڑ گئیں۔ ان بحثوں کی ابتدا ان لوگوں نے کی جو عجم کی خاک سے تھے یا ان پر عجم کا پرتو پڑا تھا۔ چونکہ یہ نامانوس صدائیں تھیں ان باتوں پر مذہبی گروہ میں جو زیادہ تر عرب سے تعلق رکھتا تھا برہمی پیدا ہو گئی اور محدثین و فقہا نہایت سختی سے بدعتیوں کے مقابلے کو اٹھے۔ اس مقابلہ کی بنا پر ان بزرگوں کو خود بھی ان مسائل میں نفی و اثبات کا پہلو اختیار کرنا پڑا لیکن جوش مخالفت نے اکثروں کو اعتدال کی حد پر نہ رہنے دیا۔ معتزلہ کا مذہب تھا کہ قرآن مجید خدا کا ایک جدید کلام ہے جو رسول اللہ ؐ کی نبوت کے ساتھ وجود میں آیا۔ لوگوں نے اس کی یہاں تک مخالفت کی کہ بعض محدثین نے تلفظ بالقرآن کو بھی قدیم ٹھہرایا۔ امام ذہلی جو امام بخاری ؒ کے اساتذہ میں سے تھے اور صحیح بخاری میں ان کی سند سے اکثر روایتیں ہیں اسی بات پر امام بخاری ؒ سے اپنے ناراض کہ ان کو حلقۂ درس نکلوا دیا اور عام حکم دے دیا کہ جو شخص بخاری کے پاس آمد و رفت رکھے وہ ہمارے حلقہ میں نہ آئے[1]۔ امام بخاری خود قرآن کے قدیم ہونے کے قائل تھے لیکن قرأت قرآن کو حادث کہتے تھے۔ ذہلی کو اصرار تھا کہ یہ بھی قدیم ہے۔

اور مسائل میں بھی اس قسم کی بے اعتدالیاں ہوئیں جن تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ امام ابو حنیفہ ؒ نے اِن تمام بحثوں میں وہی پہلو اختیار کیا جو مغز سخن تھا اور جو عقل کے ساتھ نقل کے بھی مطابق تھا۔ انھیں مسائل میں ایمان و عمل کا بھی مسئلہ تھا۔

---

[1] اِن واقعات کو حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔

مرجیہ کا مذہب ہے کہ ایمان اور عمل دو مختلف چیزیں ہیں اور ایمان اور تصدیق کامل ہو تو عمل نہ ہونا کچھ ضرر نہیں کرتا۔ ایک شخص اگر دل سے توحید و سنت کا معترف ہے اور فرائض ادا نہیں کرتا تو وہ مواخذہ سے بری ہے۔ اس رائے کا گو پہلا حصہ صحیح تھا مگر محدثین نے کچھ تفریق نہ کی اور کلیۃً اس مذہب کے مخالف ہو گئے۔ چونکہ قرآن کی بعض آیتیں بھی اس کی موید تھیں ان کی رائے کو اور بھی قوت و شدت ہوگئی۔ یہ ایک اجتہادی رائے تھا اور یہیں تک رہتا تو چنداں مضائقہ نہ تھا لیکن افسوس یہ ہے کہ ان بزرگوں نے یہاں تک شدت کی کہ جو شخص ان کی رائے کے ساتھ متفق نہ ہوتا تھا اس فاسق یا کافر سمجھتے تھے۔ قاضی ابو یوسف ایک بار شریک عدالت میں گواہ ہو کر گئے تو انھوں نے کہا "میں اس شخص کی شہادت قبول نہیں کرتا جس کا یہ قول ہے کہ نماز جزو ایمان نہیں۔

امام ابوحنیفہ کو اس سے کچھ بحث نہ تھی کہ مسئلہ فلاں شخص یا فلاں فرقہ کا ہے وہ اصل حقیقت کو دیکھتے تھے اور مغز سخن کو پہنچتے تھے۔ جب یہ بحث ان کے سامنے پیش کی گئی تو انھوں نے علانیہ کہا کہ ایمان اور عمل دو جداگانہ چیزیں ہیں اور دونوں کا حکم مختلف ہے۔ اس پر بہت سے لوگوں نے ان کو بھی مرجیہ کہا۔ لیکن وہ ایسا مرجیہ ہونا خود پسند کرتے تھے۔ محدثین اور فقہاء میں سے جو لوگ امام صاحب کے ہم زبان تھے ان کو بھی یہی خطاب عنایت ہوا۔ محدث ابن قتیبہ نے اپنی مشہور اور مستند کتاب المعارف میں مرجیہ کے عنوان سے بہت سے فقہاء اور محدثین کے نام گنائے ہیں جن میں سے چند یہ ہیں۔ ابراہیم تیمی۔ عمرو بن مرہ۔ طلق الحبیب۔ حماد بن سلیمان۔ عبدالعزیز ابی بن داؤد۔ خارجہ بن مصعب۔ عمرو بن قیس الاصر۔ ابومعاویۃ العریر۔ یحییٰ بن زکریا مسعر بن کدام۔ حالانکہ ان میں سے اکثر حدیث و روایت کے امام ہیں اور صحیح بخاری و مسلم میں ان لوگوں کی سیکڑوں روایتیں موجود ہیں ہمارے زمانہ کے بعض کوتاہ بیں جو اس پر خوش ہیں کہ امام صاحب کو بعض محدثین نے مرجیہ کہا ہے ابن قتیبہ کی فہرست دیکھتے تو شاید ان کو ندامت ہوتی۔ محدث ذہبی نے میزان الاعتدال میں مسعر بن کدام

ایمان اور عمل جداگانہ چیزیں ہیں۔

کے تذکرے میں لکھا ہے کہ ارجار (مرجیہ ہونا) بہت سے علمار کا مذہب ہے اور اس مذہب کے قائل پر مواخذہ نہ کرنا چاہیئے۔ یہ اسی ارجار کی طرف اشارہ ہے جو امام ابوحنیفہ کا مذہب تھا۔

یہ مسئلہ اگرچہ بظاہر چنداں مہتم بالشان نہ تھا لیکن اس کے نتائج بہت برا اثر رکھتے تھے۔ اسی لحاظ سے امام صاحب نے نہایت آزادی سے اس کا اظہار کیا۔ عمل کا جزوِ ایمان قرار دینا اس بات کو مستلزم ہے کہ جو شخص اعمال کا پابند نہ ہو وہ مومن بھی نہ ہو جیسا کہ خارجیوں کا مذہب ہے جو مرتکب کبائر کو کافر سمجھتے ہیں اگرچہ اکثر محدثین ایسے شخص کو کافر نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن یہ نہ سمجھنا اس وجہ سے تھا کہ وہ لزوم سے ناواقف تھے حالانکہ لزوم قطعی اور یقینی ہے جس سے انکار نہیں ہو سکتا۔

امام رازی نے جو امام شافعی کے بہت بڑے حامی ہیں کتاب مناقب الشافعی میں لکھا ہے کہ لوگوں نے امام شافعی پر یہ اعتراض کیا ہے کہ وہ متناقض باتوں کے قائل ہیں کیونکہ ایک طرف تو وہ یہ کہتے ہیں کہ ایمان تصدیق و عمل کے مجموعہ کا نام ہے ساتھ ہی اس بات کے بھی قائل ہیں کہ ترک عمل سے کوئی شخص کافر نہیں ہوتا، حالانکہ مرکب چیز کا جب ایک جزو نہ رہا تو مرکب بھی من حیث المرکب نہ رہا۔ اسی لئے معتزلہ جو اس بات کے قائل ہیں کہ عمل جزوِ ایمان ہے اس بات کے بھی قائل ہیں کہ عمل نہ ہو تو ایمان بھی نہیں۔ لیکن امام شافعی کی طرف سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اصل ایمان اقرار و اعتقاد کا نام ہے، باقی اعمال تو وہ ایمان کے ثمرات اور توابع ہیں۔ لیکن چونکہ تابع پر بھی کبھی کبھی مجازاً اصل شی کا اطلاق ہوتا ہے اس لئے مجازاً اعمال پر بھی ایمان کا اطلاق ہوا اور یہ مسلّم ہے کہ توابع کے فوت ہونے سے اصل شی فوت نہیں ہوتی۔

لیکن یہ جواب توجیہ القول بما لا یرضی بہ قائلہ ہے اور خود امام رازی کو اس کا اعتراف کرنا پڑا۔ چنانچہ جواب کے بعد فرماتے ہیں۔ فیہ ترک ھذا المذھب

اور اپنے امام کے نہایت طرفدار ہیں۔ لیکن چونکہ صاحب نظر اور نکتہ شناس ہیں اِن کو تسلیم کرنا پڑا کہ یا عمل کو ایمان کے توابع سے شمار کرنا چاہیئے جو شخص پابند عمل نہیں مؤمن بھی نہیں۔

اس بحث کے متعلق امام ابو حنیفہ کی ایک تحریر موجود ہے جس کی طرز استدلال استنباط نتائج سے امام صاحب کی دقت نظر کا اندازہ ہو سکتا ہے اور صل مسئلہ کی حقیقت کھلتی ہے اس لئے موقع پر ہم اِس کا حوالہ دینا مناسب سمجھتے ہیں یہ تحریر عثمان بتی کے ایک خط کا جواب ہے جو انھوں نے امام صاحب کو لکھا تھا۔ عثمان اس زمانہ کے ایک مشہور محدّث تھے۔ عام لوگوں میں جب امام ابو حنیفہ کے ان خیالات کے چرچے ہوئے تو انھوں نے امام صاحب کو ایک دوستانہ خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا کہ لوگ آپ کو مرجیہ کہتے ہیں اور بیان کرتے ہیں کہ آپ مؤمن کا ضال (گمراہ) ہونا جائز قرار دیتے ہیں مجھ کو ان باتوں کے سننے سے نہایت رنج ہوتا ہے کیا یہ باتیں صحیح ہیں؟" اس کے خط کے جواب میں امام صاحب نے ایک طولانی خط لکھا ہے جس کے فقرے ہم کہیں کہیں سے انتخاب کرتے ہیں۔ حمدُ نعت کے بعد عثمان بتی کی دوستانہ نصیحت اور خیر خواہی کا شکریہ ادا کرکے اصل مضمون اسی طرح شروع کیا ہے کہ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ رسول اللہ ؐ کے مبعوث ہونے سے پہلے تمام لوگ مشرک تھے۔ رسول اللہ ؐ جب مبعوث ہوئے تو لوگوں کو اس بات کی طرف دعوت کی کہ خدا کو ایک مانیں اور رسول اللہ ؐ جو کچھ لائے اس کو تسلیم کریں۔ پس جو شخص ایمان میں داخل ہوتا تھا اور شرک چھوڑ دیتا تھا اس کی جان اور مال حرام ہو جاتا تھا پھر خاص ان لوگوں کے لئے جو ایمان لا چکے تھے فرائض کے احکام آئے پس اس کا پابند ہونا عمل ٹھہرا اور خدا نے اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ۔ وَمَنْ یُّؤْمِنْ بِاللّٰہِ وَیَعْمَلْ صَالِحًا۔ اِس قسم کی اور بھی آیتیں ہیں سے ثابت ہوتا ہے کہ عمل کے نہ ہونے سے ایمان نہیں جاتا رہتا۔ البتہ اگر تصدیق و اعتقاد نہ ہو تو مومن کا اطلاق نہیں ہو سکتا...........

اور عمل و تصدیق کا دو جداگانہ چیز ہونا اس سے بھی ظاہر ہے کہ تصدیق کے لحاظ سے
سب مسلمان برابر ہیں لیکن اعمال کے لحاظ سے مراتب میں فرق ہوتا ہے کیونکہ دین
مذہب سب کا ایک ہی ہے ۔ خدا نے خود کہا ہے ۔ شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ
نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ
یعنی تمہارے لئے اس دین کو مشروع کیا جس کی وصیت نوح کی تھی اور جو تجھ پر وحی
بھیجی اور جس کی وصیت ابراہیم و موسیٰ و عیسیٰ کو کی وہ یہ ہے کہ دین کو قائم رکھو
اور اس میں متفرق نہ ہو ۔

آپ کو جاننا چاہیئے کہ تصدیق میں ہدایت اور اعمال میں ہدایت یہ دونوں دو
چیزیں ہیں ۔ آپ ایک شخص کو جو فرائض سے ناواقف ہو مومن کہہ سکتے ہیں پس ایسا
فرائض کے لحاظ سے جاہل اور تصدیق کے لحاظ سے مومن ہے خود خدا نے قرآن پاک
میں یہ اطلاقات کئے ہیں ۔ کیا آپ اس شخص کو جو خدا و رسول خدا کے پہچاننے میں
میں گمراہ ہو اس شخص کی برابر قرار دیں گے جو مومن ہو لیکن اعمال سے ناواقف
ہو ۔ خدا نے جہاں فرائض بتائے ہیں اس موقع پر ارشاد فرمایا ہے کہ يُبَيِّنُ اللّٰهُ
لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا (یعنی خدا نے اس لئے بیان کیا کہ تم گمراہ نہ ہو) دوسری آیت میں ہے
اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى (یعنی ایک گمراہ ہو تو دوسرا
یاد دلائے) حضرت موسیٰ کی زبان سے فرمایا فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ (یعنی میں
نے جب وہ کام کیا تب میں گمراہ تھا) ان آیتوں کے علاوہ اور بہت سی آیتیں ہیں جو اس
دعویٰ کے ثبوت کے لئے دلائل قاطعہ ہیں اور حدیثیں تو اور بھی واضح اور صاف ہیں ۔
حضرت عمر رض اور حضرت علی رض امیر المومنین کے لقب سے پکارے جاتے تھے تو کیا اس کے
معنی یہ تھے کہ وہ صرف ان لوگوں کے امیر تھے جو فرائض و اعمال کے پابند تھے حضرت
علی رض نے شام والوں کو جو ان سے لڑے تھے مومن کہا ۔ کیا قتل سے بڑھ کر کوئی
گناہ ہے ۔ پھر جو لوگ قتل کے مرتکب ہوئے کیا آپ قاتلین اور مقتولین دونوں کو
برسرحق قرار دیتے ہیں ۔ اگر آپ صرف ایک کو (یعنی حضرت علی رض اور طرفداران علی

کو) برسرحق تسلیم کریں گے تو دوسرے فریق کو کیا کہیں گے اس کو خوب سمجھ لیجئے اور غور کیجئے۔ میرا یہ قول ہے کہ اہل قبلہ سب مؤمن ہیں اور فرائض کے ترک سے کافر نہیں ہوسکتے۔ جو شخص ایمان کے ساتھ تمام فرائض بجالاتا ہے وہ مؤمن اور جنتی ہے۔ جو ایمان اور اعمال دونوں کا تارک ہے وہ کافر اور دوزخی ہے۔ جو شخص ایمان رکھتا ہے اور فرائض اس سے ترک ہوجاتے ہیں وہ مسلمان ضرور ہے لیکن گنہگار مسلمان ہے خدا کو اختیار ہے اس پر عذاب کرے یا معاف کردے۔

امام صاحب نے جس خوبی سے اس دعوے کو ثابت کیا ہے انصاف یہ ہے کہ اس سے بڑھ کر نہیں ہوسکتا۔ فرائض اور ایمان باہمی امتیاز کی اس سے عمدہ تر دلیل کیا ہوگی کہ آغاز اسلام میں ایمان کی دعوت ہوئی اور فرائض کا وجود نہ تھا۔ امام صاحب نے قرآن کی جو آیتیں استدلال میں پیش کی ہیں ان سے بداہۃً ثابت ہوتا ہے کہ دونوں دو چیزیں ہیں۔ کیونکہ ان تمام آیتوں میں عمل کو ایمان پر معطوف کیا ہے اور ظاہر ہے کہ جزو کل پر معطوف نہیں ہوسکتا مَن یُّؤمِنْ بِاللّٰہِ وَیَعْمَلْ صَالِحًا میں حرفِ تعقیب آیا ہے جس سے اس بحث کا قطعی فیصلہ ہوجاتا ہے۔ ان دلائل قاطعہ کے مقابلے دوسری طرف بعض آیتیں اور حدیثیں ہیں لیکن ان میں سے کوئی اثبات مدعا کے لئے کافی نہیں۔ بڑا استدلال اس حدیث پر ہے کہ "مؤمن ہوکر چوری اور زنا نہیں کرتا" حالانکہ یہ کلام کے زور دینے کا ایک پیرایہ ہے۔ ہم اپنی زبان میں کہتے ہیں کہ بھلا آدمی ہوکر تو ایسا کام نہیں کرسکتا جس کا صرف یہ مطلب ہوتا ہے کہ وہ کام شان و شرافت کے خلاف ہے بے شبہ زنا اور سرقہ بھی ایمان کی شان کے خلاف ہیں اور حدیث کا مقصد اسی قدر ہے ورنہ ابوذر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں صراحۃً یہ الفاظ موجود ہیں کہ جو شخص لا الٰہ الا اللہ کا قائل ہے جنت میں جائے گا گو زانی اور چور ہو۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اَلْاِیْمَانُ لَا یَزِیْدُ وَلَا یَنْقُصُ یعنی ایمان کم و بیش نہیں ہوسکتا ہے۔ بے شبہ یہ امام صاحب کا قول ہے لیکن اس کی تعبیر میں

لوگوں نے غلطی کی ہے نہ صرف محدثین اور شافعیہ نے بلکہ خود احناف نے بھی۔ ایمان کی کمی اور زیادتی دو لحاظ سے ہو سکتی ہے ایک اس اعتبار سے کہ وہ مقولۂ کیف سے ہے جس میں شدت اور ضعف ممکن ہے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ ایمان یقین کا نام ہے اور یقین کے مراتب متفاوت ہوتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب خدا سے کہا اے خدا تو مردوں کو کیونکر جلاتا ہے؟ تو ارشاد ہوا اَوَلَمْ تُؤْمِنْ (یعنی کیا تجھ کو اب تک یقین نہیں آیا؟) عرض کیا کہ یقین ضرور ہے لیکن لِیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ اور زیادہ اطمینان خاطر چاہتا ہوں" خدا نے متعدد آیتوں میں صاف تشریح کردی ہے کہ ایمان میں ترقی ہوتی ہے زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا اس مسئلہ میں نص صریح ہے لیکن امام ابو حنیفہ کو بلحاظ اس معنی کے نہ انکار ہے نہ اس وقت یہ امر زیر بحث تھا۔ امام صاحب کے دعوے کا اور منشا ہے اور بالکل صحیح ہے جن لوگوں نے مذہب کو جزو ایمان قرار دیا ہے ان کا مذہب ہے کہ ایمان بلحاظ مقدار کے زیادہ کم ہوتا ہے۔ جو شخص اعمال کا زیادہ پابند ہے وہ زیادہ مؤمن ہے جو گنہگار ہے وہ کم مؤمن ہے۔ محدثین صراحتہً اس کے مدعی ہیں اور اس پر دلیلیں لاتے ہیں علامہ قسطلانی صحیح بخاری کی شرح میں لکھتے ہیں فَاعْلَمْ اَنَّ الْاِيْمَانَ يَزِيْدُ بِالطَّاعَاتِ وَيَنْقُصُ بِالْمَعَاصِيْ (یعنی ایمان ثواب کے کام کرنے سے زیادہ ہوتا ہے اور گناہ سے گھٹ جاتا ہے" اور محدثین نے بھی جا بجا اس کی تصریح کی ہے۔ امام ابو حنیفہ اس اعتبار سے ایمان کی زیادتی و نقصان کے منکر تھے۔ ان کے نزدیک جب اعمال کی کمی بیشی سے ایمان کی کمی بیشی نہیں ہو سکتی اور بالکل صحیح ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ" ابوبکر کو جو تم لوگوں پر ترجیح ہے وہ کثرت صوم و صلوٰۃ کی وجہ سے نہیں بلکہ اس چیز کی وجہ سے ہے جو اس کے دل میں ہے" غرض امام صاحب کا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ ایمان بلحاظ کیفیت یعنی شدت وضعف کے زیادہ و کم نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ان کا یہ دعویٰ ہے کہ ایمان مقدار کے اعتبار سے کم و بیش نہیں ہوتا۔ یہ دعویٰ اس بات کی فرع ہے کہ اعمال جزو ایمان نہیں ہیں

اور اس کو ہم ابھی ثابت کر چکے ہیں۔

نفسِ تعلق ایمان میں سب برابر ہیں

امام صاحب اِس بات کے بھی قائل نہ تھے کہ متعلق ایمان میں کچھ تفاوت نہیں ہے یعنی معتقدات کے لحاظ سے سب مسلمان برابر ہیں۔ ایمان کے لئے جن مسائل پر اعتقاد رکھنا ضروری ہے وہ سب کے لئے یکساں ہیں صحابہ اور عام مسلمان اس لحاظ سے برابر ہیں کہ وہ دونوں ایک ہی چیز یعنی توحید اور نبوّت کا اعتقاد رکھتے ہیں فرق تو اعتقاد کی شدّت اور ضعف میں ہے۔ اسی مطلب کو امام صاحب نے عثمان بتی کے جواب میں ان الفاظ سے بیان کیا ہے کہ دِیْنُ اَهْلِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَاحِدٌ (یعنی آسمان اور زمین والوں کا ایک ہی دین ہے) پھر اس دعویٰ پر آیت قرآنی سے استدلال کیا ہے شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا۔ یعنی ہم نے تمہارے لئے وہی دین مشروع کیا جس کی وصیت نوح ؑ کو کی تھی۔) مخالفین نے بڑے زور شور سے امام صاحب پر یہ الزام لگایا ہے کہ وہ اس بات کے قائل تھے کہ میرا ایمان اور ابوبکر صدیق رضؓ کا ایمان برابر ہے۔" اگرچہ امام صاحب کی طرف اس قول کی اسناد ثابت نہیں۔ لیکن اگر ثابت ہو تو کیا نقصان ہے۔ جس اعتبار سے وہ مساوات کے مدعی ہیں اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ تعجب ہے اور سخت تعجب ہے کہ ایسا صاف مسئلہ معترضوں کی سمجھ میں نہیں آیا۔ خطیب بغدادی نے صفحے کے صفحے سیاہ کر دیئے اور یہ نہ سمجھے کہ امام صاحب کا دعویٰ کیا ہے۔ ان کو یہ الفاظ نہایت گراں گذرتے ہیں کہ ہمارا اور صحابہ کا ایمان برابر ہے۔ وہ نہیں سمجھتے کہ بہت سی چیزوں میں ہم اور صحابہ برابر ہیں تاہم ہم میں اور صحابہ میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ اگرچہ اس قسم کے تمام مسائل میں امام صاحب اپنی خاص رائیں رکھتے تھے۔ لیکن وہ مخالف رایوں پر کفر و فسق کا الزام نہیں لگاتے تھے۔ یہ فیاضِ دلی امام صاحب کا خاصہ ہے اور قرون اولیٰ کے بعد اسلام میں اس کی بہت کم نظیریں ملتی ہیں۔ اسلام کو ان مشاجرات نے زیادہ نقصان نہیں پہنچایا جو اختلافِ آراء کی بناء پر قائم ہو گئیں۔ ان اختلافات کی بنیاد اگرچہ خود صحابہ کے زمانے میں شروع ہو چکی تھی

عبداللہ بن عباسؓ اور بہت سے صحابہ کا اعتقاد تھا کہ رسول اللہؐ نے معراج میں خدا کو آنکھوں سے دیکھا۔ حضرت عائشہؓ نہایت اصرار سے اس کے مخالف تھیں۔ امیر معاویہ کو معراج جسمانی سے انکار تھا۔ حضرت عائشہؓ سماع موتیٰ کی قائل نہ تھیں لیکن اس زمانہ تک ان اختلافات پر ہدایت و گمراہی کا مدار نہ تھا۔ جو لوگ مختلف رائیں رکھتے تھے ان میں بھی کسی نے تکفیر یا تفسیق نہیں کی۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے ایک شخص نے پوچھا کہ "کچھ لوگ پیدا ہوتے ہیں جو قرآن کی غلط تاویل کرتے ہیں اور ہم کو کافر قرار دیتے ہیں وہ خود کافر ہیں یا نہیں؟" حضرت عبداللہؓ نے فرمایا کہ "اس وقت تک کوئی کافر نہیں ہو سکتا جب تک کہ خدا کو دو نہ کہے"۔[1] صحابہ کے بعد یہ اختلافات زور پکڑتے گئے اور رفتہ رفتہ مستقل فرقے قائم ہو گئے۔ اعتقادی اور فقہی مسائل اکثر ایسے ہیں جن میں نص قاطع موجود نہیں اور ہیں تو متعارض ہیں اس لئے استنباط اور رفع تعارض کی ضرورت نے اجتہاد کو بہت وسعت دی اور سینکڑوں رائیں قائم ہو گئیں۔ بے شبہ ان میں بہت سی رائیں صحیح نہیں۔ لیکن یہ ضرور نہیں کہ وہ سب کفر ہوں۔

افسوس ہے کہ سرگرم طبیعتیں جو مذہبی جوش اور تقدس کے نشہ میں سرشار تھیں اختلاف رائے کے صدمہ کی تاب نہ لاسکیں اور نہایت بے صبری سے مخالفت پر آمادہ ہو گئیں، بات بات پر کفر کے فتوے ہونے لگے۔ جو لوگ جس قدر زیادہ مذہبی حرارت رکھتے تھے اسی قدر کفر کے اطلاق میں کم احتیاط کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ ہر فریق نے ایک دوسرے کی ضلالت و گمراہی ثابت کرنے کے لئے موضوع روایتوں سے اعانت لی اور اس قسم کی حدیثیں ایجاد ہونے لگیں کہ میری امت میں بہت سے فرقے پیدا ہوں گے جن میں صرف ایک جنتی ہو گا باقی سب دوزخی۔ اس فرضی تعداد کو بھی پورا کرنا ضروری تھا اس لئے کھینچ تان کر ۷۳ فرقے قرار دیئے اور سب کے الگ الگ نام رکھے اس پر بھی تسکین نہ ہوئی تو ہر فرقے کے لئے جدا جدا روایتیں گھڑیں مثلاً القدریۃ مجوس ھذہ الامۃ

[1] آثار امام محمد صفحہ ۶۵

وغیرہ وغیرہ۔

اِن تعصبات اور جھگڑوں نے جماعت اسلامی کے تمام اجزا پراگندہ کر دیئے اور مذہب، اخلاق، حکومت، تمدن، معاشرت، سب کا نقشہ بگڑ گیا۔ اس عالمگیر آشوب میں صرف ایک امام ابو حنیفہؒ تھے جن کی صدا سب سے الگ تھی اور جو پکار کر کہتے تھے لَا نُكَفِّرُ أَحَدًا مِنْ أَهْلِ الْقِبْلَةِ (یعنی اہل قبلہ میں سے ہم کسی کو کافر نہیں سمجھتے)[1] اس وقت تو اس صدا پر چنداں توجہ نہیں ہوئی لیکن زمانہ جس قدر ترقی کرتا گیا اس جملے کی قدر بڑھتی گئی یہاں تک کہ وہ علم کلام کا ایک بیش بہا اصول بن گیا۔ اگرچہ افسوس ہے کہ اس پر عمل کیا گیا اور تکفیر کے غلغلے اب بھی پست نہ ہوئے۔

امام ابو حنیفہؒ اہل قبلہ کی تکفیر نہیں کرتے تھے

امام صاحب کی یہ رائے نہایت غور و تحقیق و تجربہ کے بعد قائم ہوئی تھی۔ بڑے بڑے مشہور بانیان مذہب انھیں کے زمانے میں پیدا ہوئے تھے اور امام صاحب کو ان سے ملنے کا موقع حاصل ہوا تھا۔ خارجیوں کا صدر مقام بصرہ تھا جو امام صاحب کے شہر سے نہایت قریب تھا۔ واصل بن عطار، عمرو بن عبید جو مذہب اعتزال کے بانی اور مروج تھے بصرہ ہی کے رہنے والے تھے اور امام صاحب کے ہمعصر تھے۔ جہم بن صفوان جس کے نام سے فرقہ جہمیہ مشہور ہے اسی زمانہ میں تھا۔ امام صاحب ان میں سے اکثروں سے ملے اور ان کے خیالات سے مطلع ہوئے تھے۔ ان فرقوں کی نسبت جو اقوال مشہور تھے کچھ تو سرے سے غلط اور افترا تھے بعض کی تعبیر غلط طور پر کی گئی تھی، بعض درحقیقت لغو اور باطل تھے لیکن کفر کی حد تک نہ پہنچتے تھے، اس لیے امام ابو حنیفہؒ نے یہ عام حکم دے دیا کہ اہل قبلہ سب مومن ہیں وہ دیکھ رہے تھے کہ جن مسائل پر قیامتیں برپا ہیں جو کفر و اسلام کی معیار قرار دیدی گئی ہیں وہ صرف لفظی بحثیں اور رفع ضمنی اصطلاحیں ہیں۔ سب سے بڑا مسئلہ قدم قرآن کا تھا جس کو لوگوں نے کلمۂ توحید کی برابر قرار دیا تھا۔ بڑے بڑے علماء کا قول ہے کہ "اسلام کو دو شخصوں نے نہایت نازک وقتوں میں محفوظ رکھا۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ جنھوں نے رسول اللہ

[1] کتاب الاوائل ابو ہلال عسکری۔

کی وفات کے بعد مرتدین عرب کا استیصال کیا اور امام احمد حنبل جو مامون رشید کے زمانے میں حدوث قرآن کے منکر رہے بلکہ ایک اعتبار سے امام احمد حنبل کو ترجیح ہے کیونکہ صحابہ حضرت ابوبکرؓ کے معاون اور انصار تھے لیکن امام حنبل کا کوئی مددگار نہ تھا۔

رجال کی کتابوں میں جب کسی کو ثقہ اور مستند ثابت کیا جاتا ہے سب سے بڑی دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ " وہ حدوث قرآن کو کفر سمجھتا تھا " حالانکہ یہ صرف لفظی بحث ہے۔ جو لوگ قرآن کو حادث کہتے تھے ان کی غرض ان الفاظ و اصوات سے تھی جن کا ظہور رسول اللہ ﷺ کی زبان سے ہوا جس پر عام طور سے قرآن کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ جو قدیم مانتے تھے وہ کلام سے کلام نفسی کی مراد لیتے تھے جو خدا کی صفات میں سے ہے۔ امام ابوحنیفہ کے اس بارہ میں مختلف اقوال ہیں اور وہ اسی تفصیل کی بناپر ہے۔ ایک شخص نے ان سے پوچھا کہ قرآن حادث ہے یا قدیم؟ فرمایا حادث۔ کیونکہ قرآن خدا نہیں اور جو خدا نہیں وہ حادث ہے۔

غرض اس قسم کے مسائل نفیاً یا اثباتاً قطعی نہیں ہیں اور اس وجہ سے وہ کفر و اسلام کا معیار نہیں ہو سکتے۔ امام ابوحنیفہ کی نکتہ شناسی کی بڑی دلیل یہ ہے کہ انھوں نے اسلام کے دائرہ کو جو مَنْ قَالَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ کی وسعت رکھتا تھا اصلی وسعت پر قائم رکھا۔ افسوس ہے کہ ان کی اس رائے پر بہت کم لحاظ کیا گیا ورنہ امام غزالی محی الدین عربی حضرت غوث الاعظم ابن تیمیہ و ابو طالب مکی کو ہم فقہا کی زبان سے کافر نہ سنتے۔

حدیث اور اُصول حدیث

یہ خیال اگرچہ غلط اور بالکل غلط ہے کہ امام ابوحنیفہ حدیث میں کم مایہ تھے تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ عام طور سے وہ محدث کے لقب سے مشہور نہیں۔ بزرگان سلف میں سینکڑوں ایسے گذرے ہیں جو اجتہاد اور روایات دونوں کے جامع تھے

لیکن شہرت اسی صفت کے ساتھ ہوئی جو ان کا کمال غالب تھا امام ابوحنیفہؒ کی تو حدیث میں کوئی تصنیف نہیں۔ تعجب ہے کہ امام مالک و شافعی بھی اسی لقب سے مشہور ہوئے نہ ان کی حدیثوں کو وہ قبول عام حاصل ہوا جو صحاح ستہ کو ہوا۔ احمد حنبل ان لوگوں کی نسبت علم حدیث میں زیادہ نام آور ہیں ان کی مسند کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ صحیح حدیثوں کا اتنا بڑا مجموعہ اور کہیں نہیں مل سکتا۔ لیکن جس قدر روایت میں ان کا زیادہ اعتبار ہے اسی قدر استنباط اور اجتہاد میں ان کی نام آوری کم ہے۔ علامہ طبریؒ نے جو خود بھی محدث اور مجتہد تھے مجتہدین میں ان کا شمار نہیں کیا[1]۔ قاضی ابن عبد البر نے کتاب الانتہار فی ثلاثۃ الفقہار میں جو مجتہدین کے حالات میں ہے امام ابوحنیفہ و امام مالک و امام شافعی پر اکتفا کی۔ امام رازی مناقب الشافعی میں لکھتے ہیں کہ امام شافعی کے بعد کوئی مجتہد مطلق پیدا نہیں ہوا۔ اگرچہ امام احمد حنبلؒ کی نسبت کثیر گروہ علمار کی یہی رائے تھی کہ وہ اجتہار کا بل کا منصب رکھتے تھے تاہم ان سے اجتہاد پر اتفاق عام نہ ہوا۔

محدث و مجتہد کی حیثیتیں الگ الگ ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ محدث اور مجتہد کی حیثیتیں الگ الگ ہیں۔ محدث مواعظ قصص فضائل سیر پر ایک قسم کی روایتوں کا استقصار کرتا ہے بخلاف اس کے مجتہد کو زیادہ تر صرف ان احادیث سے غرض ہوتی ہے جن سے کوئی حکم شرعی مستنبط ہوتا ہے یہی سبب ہے کہ محدثین کی بہ نسبت مجتہدین ہمیشہ قلیل الروایۃ ہوتے ہیں۔ موطا میں جو امام مالک کی تمام روایتوں کا مجموعہ ہے زیادہ سے زیادہ ہزار حدیثیں ہیں جن میں صحابہ اور تابعین کے اقوال بھی شامل ہیں۔ امام شافعی نے امام احمد حنبل کے سامنے اکثر اعتراف کیا ہے کہ تم لوگ بہ نسبت ہمارے احادیث سے زیادہ واقف ہو[2]۔ قاضی یحییٰ بن اکثم جو ترمذی کے شیخ ہیں حسرت سے کہا کرتے تھے کہ "امام شافعی نے علم حدیث کی طرف پوری توجہ کی ہوتی تو ہم لوگوں کو سب سے بے نیاز کر دیا ہوتا"۔ حافظ ابن حجر نے توالی التاسیس میں جو امام شافعی کے حالات میں ایک مختصر رسالہ ہے جہاں امام شافعی کے شیوخ کے حدیث سے بحث کی ہے خاتمہ پر لکھا ہے تذکرۃ کبیر

[1] طبقات المفسرین حافظ جلال الدین سیوطی ترجمہ علامہ طبری ۱۲ [2] توالی التاسیس لحافظ ابن حجر صفحہ ۱۰۵۰

من الشیوخ کعادۃ اھل الحدیث لاقبالہ علی الاشتغال بالفقہ (یعنی وہ بہت سے شیوخ سے نہیں ملے جیسا کہ اہل حدیث کی عادت ہے کیونکہ ان کو فقہ کا شغل رہتا تھا) حافظ ابن حجر نے امام شافعی کی نسبت قلّتِ شیوخ کا جو سبب بیان کیا ہے امام ابوحنیفہ کی قلت روایت کا بھی وہی سبب ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ بعض لوگوں نے اس دائرے کو زیادہ وسیع کیا اور عموماً اُن کی قلّتِ روایت کے قائل ہوئے یہ خیال کچھ نیا نہیں ہے اگلے زمانے میں بھی بعض بعض لوگوں کی یہ رائے تھی اور وہی غلط فہمی آج تک چلی آتی ہے۔

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ امام ابوحنیفہ کے وہ واقعات جو منظر عام پر نمایاں ہیں ان سے ایک ظاہر بین شخص ایسی ہی رائے قائم کر سکتا ہے۔ حدیث میں ان کی کوئی تصنیف موجود نہیں صحاح میں بجز ایک دو روایت کے ان کا نام تک نہیں پایا جاتا۔ سب سے زیادہ یہ کہ ان کی شہرت اہل الرائے کے لقب سے ہے جس سے متبادر ہوتا ہے کہ حدیث سے ان کو کم تعلق تھا۔ اس قدر ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ مغازی، سیر، قصص وغیرہ میں ان کی نظر چنداں وسیع نہ تھی۔ امام مالک و امام شافعی کا بھی یہی حال تھا لیکن احکام و عقائد کے متعلق امام ابوحنیفہ کو جو واقفیت اور تحقیق حاصل تھی اس سے انکار کرنا صرف کم نظری اور ظاہر بینی کا نتیجہ ہے ان کی تصنیف یا روایتوں کا مدوّن نہ ہونا قلتِ نظر کی دلیل نہیں ہو سکتا، حضرت ابوبکر صدیقؓ سے زیادہ کسی صحابی کو رسول اللہؐ کے ساتھ جلوت و خلوت میں رہنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا، رسول اللہؐ کے اقوال و افعال سے جس قدر واقف تھے اور کون ہو سکتا تھا۔ لیکن حدیث کی تمام کتابوں میں ان کی روایت سے جسقدر صحیح حدیثیں ہیں ان کی تعداد سترہ سے زیادہ نہیں[1]۔ کون شخص کہہ سکتا ہے کہ ان کو صرف اسی قدر حدیثیں معلوم تھیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بعد حضرت عمر فاروقؓ

خلفائے اربعہ کی قلت روایت

[1] مناقب الشافعی میں امام رازی نے خلفائے اربعہ کی نسبت لکھا ہے یہ تعداد میں نے امام شافعی کے قول کے موافق لکھی ہے اور محدثین کے نزدیک اس سے زیادہ حدیثیں ان لوگوں سے مروی ہیں تاہم اس سے زیادہ تعداد نہیں پہنچتی جس پر کثرت روایت کا اطلاق کیا جائے۔

کا درجہ ہے ان سے بھی پچاس حدیثیں مروی ہیں جن میں سے بعض کا کافی ثبوت نہیں۔ حضرت عثمانؓ اور جناب امیرؓ کا بھی یہی حال تھا بخلاف ان کے حضرت ابوہریرہؓ سے ۵۳۴۶ عبدالرحمٰن بن عباسؓ سے ۲۲۶۰۔ جابرؓ سے ۱۵۴۰ عبداللہ بن عمرؓ جو رسول اللہؐ کے زمانے میں جوان تھے ۲۶۳۰ حدیثیں مروی ہیں اگر روایتوں کا موجود ہونا ہی معیار ہے تو خلفاء اربعہ کی نسبت تسلیم کرنا پڑے گا یا ان کا حافظہ ضعیف اور نہایت ضعیف تھا یا دانستہ ان کو رسول اللہؐ کے اقوال و افعال کی طرف توجہ اور التفات نہ تھا وحاشا عن ذالک۔ یہ سچ ہے کہ صحاح ستہ کے مصنفین نے امام صاحب سے روایت نہیں کی۔ (دو ایک روایتیں مستثنیٰ ہیں)، لیکن اس الزام میں اور ائمہ بھی شریک ہیں امام شافعی نے .... جن کو بڑے بڑے محدثین مثلاً امام احمد حنبل، اسحٰق بن راہویہ، ابوثور حمیدی، ابوزرعۃ الرازی، ابوحاتم نے حدیث اور روایت کا مخزن تسلیم کیا ہے ان کی سند صحیحین میں ایک بھی موجود نہیں۔ بلکہ بخاری و مسلم کسی اور تصنیف میں بھی امام شافعی کی سند سے کوئی روایت نہیں کی۔ امام رازی نے بخاری و مسلم کی اس بے اعتنائی کی بہت سی تاویلیں کی ہیں مگر کوئی معقول بات نہیں بنا سکے۔ صحیحین پر موقوف نہیں۔ ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ، نسائی میں بھی بہت کم ایسی حدیثیں ہیں جن کے سلسلۂ رواۃ میں امام شافعی کا نام آیا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض محدثین نے اعتماد اور استنباط کا جو معیار قرار دیا تھا اس میں اہل نظر بلکہ اکثر لوگوں کے لئے کم گنجائش تھی۔ علامہ قسطلانی نے شرح صحیح بخاری میں لکھا ہے کہ امام بخاری فرمایا کرتے تھے کہ میں نے کسی ایسے شخص سے حدیث نہیں لکھی جس کا یہ قول نہ تھا کہ اَلْاِیْمَانُ قَوْلٌ وَّعَمَلٌ[1] اگر یہ صحیح ہے تو امام ابوحنیفہ کو ان کے دربار میں پہنچنے کی کیونکر امید ہو سکتی ہے۔ امام بخاری نے تاریخ کبیر میں امام شافعی کا ذکر کیا ہے لیکن جس بے پروائی سے کیا ہے اس کے لحاظ سے امام رازی نے یہی غنیمت سمجھا کہ تضعیف نہیں کی۔ چنانچہ امام شافعی کے فضائل میں فرماتے ہیں:۔ واما الامام محمد بن اسماعیل البخاری فقد ذکر الشافعی فی تاریخہ الکبیر فقال باب

بخاری و مسلم نے امام شافعی کے واسطے سے کوئی روایت نہیں کی

جو شخص عمل کو ایمان کی حقیقت میں داخل نہیں سمجھتا تھا امام بخاری اس سے

[1] حافظ ابن حجر نے فتح الباری کے مقدمہ میں امام بخاری کا یہ قول نقل کیا ہے۔

محمد بن ادریس الشافعی القرشی مات سنۃ اربع و مائتین ثم انہ ما ذکرہ فی باب الضعفاء مع علیہ بانہ کان قد روی شیئاً کثیراً ولو کان من الضعفاء فی ھذا الباب الذکر۔ (یعنی امام بخاری نے شافعی کا تاریخ کبیر میں کیا ہے چنانچہ فلاں باب میں لکھا ہے کہ محمد بن ادریس بن عبداللہ الشافعی القریشی نے ۲۰۴ھ میں وفات پائی۔ لیکن ان کو ضعفاء کے باب میں ذکر نہیں کیا حالانکہ امام بخاری جانتے تھے کہ شافعی نے بہت سی حدیثیں روایت کی ہیں اور اگر وہ اس باب میں ضعیف ہوتے تو امام بخاری ضرور ان کو ضعیف لکھتے۔ امام اوزاعی جو محدث اور مجتہد مستقل تھے اور بلاد شام میں ان کا وہی اعزاز و اعتبار تھا جو عرب و عراق میں امام مالک و شافعی کا ان کی نسبت کسی نے امام احمد حنبل سے رائے پوچھی۔ فرمایا "حدیث ضعیف و رائے ضعیف"' اصل یہ ہے کہ مجتہدین جس چیز پر فخر کر سکتے ہیں وہ دقت نظر' قوت استنباط' استخراج مسائل' تفریع احکام ہے۔ لیکن محدثین کے ایک گروہ کے اسی روایت سے اس بنار پر احتراز کیا ہے کہ ان پر رائے غالب تھی اور فروع احکام کی تفریع کرتے تھے۔ ان باتوں کے ساتھ بادشاہ کی صحبت میں بیٹھتے تھے اور منصب قضا پر مامور تھے[1] اگر فروع اور احکام کا استنباط بھی جرم ہے تو بے شبہ امام ابوحنیفہؒ قاضی ابویوسف سے زیادہ مجرم ہیں[2]۔

البتہ یہ بات غور کے قابل ہے کہ امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اتباع کو کیوں اہل الرائے کہا جاتا تھا۔ اس باب میں اکثر لوگوں نے غلطی کی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے شہرت عام کے مقابلے میں تحقیق کی پروا نہ کی۔

اس بحث کے تصفیہ کے لئے سب سے پہلے یہ پتہ لگانا چاہیئے کہ یہ لقب کب ایجاد ہوا اور کن لوگوں پر اطلاق کیا گیا۔

جہاں تک ہم کو علم ہے اس لقب کے ساتھ اوّل جس کو یہ امتیاز حاصل ہے وہ ربیعۃ الرائے ہیں جو امام مالک کے استاد اور شیخ الحدیث تھے۔ رائے کا لفظ

---

[1] مناقب الشافعی امام الرازی باب رابع۔ [2] تاریخ ابن خلکان ترجمہ فارسی ابویوسف ۱۲۔

ان کے نام کا جزو بن گیا ہے اور تاریخ اسماء الرجال میں ہمیشہ ان کا نام ربیعۃ الرائے لکھا جاتا ہے یہ مشہور محدث اور فقیہ تھے اور بہت سے صحابہ سے ملے تھے۔ علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں ان کا ذکر ان لفظوں سے کیا ہے " تمام اصحاب کتب (یعنی صحاح ستہ) نے ان سے احتجاج کیا ہے۔" عبد العزیز ماجشون کا قول ہے کہ " واللہ میں نے ربیع سے زیادہ کسی کو حافظ الحدیث نہیں دیکھا "

اسی زمانہ میں اور اس کے بعد اور لوگ بھی اس لقب سے پکارے گئے۔ محدث ابن قتیبہ نے کتاب المعارف میں اہل الرائے کی سرخی سے ایک باب باندھا ہے اور عنوان کے نیچے نام لکھے ہیں " ابن ابی الیلیٰ، ابوحنیفہ، ربیعۃ الرائے، زفر، اوزاعی، سفیان ثوری، مالک ابن انس، ابو یوسف قاضی، محمد بن حسن " ابن قتیبہ نے ۲۶۶ھ میں وفات پائی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کم از کم تیسری صدی تک مذکورہ بالا لوگ اہل الرائے کے لقب سے مشہور تھے ۔ اگرچہ یہ سب لوگ درحقیقت (زفر کے سوا) محدث ہیں۔ لیکن امام مالک، سفیان ثوری، امام اوزاعی کی شہرت تو محتاج بیان نہیں ۔ اصل یہ ہے کہ جو لوگ علم حدیث کی درس و تدریس میں مشغول تھے ان میں دو فرقے قائم ہو گئے تھے ایک وہ جس کا کام صرف حدیثوں اور روایتوں کا جمع کرنا تھا وہ حدیث سے صرف من حیث الروایۃ بحث کرتے تھے یہاں تک کہ ان کو ناسخ و منسوخ سے کچھ سروکار نہ تھا۔ دوسرا فرقہ حدیثوں کو استنباط، احکام اور استخراج مسائل کے لحاظ سے دیکھتا تھا اور کوئی نص صریح نہیں ملتی تھی تو قیاس سے کام لیتا تھا۔ اگرچہ یہ دونوں حیثیتیں دونوں فریق میں کسی قدر مشترک تھیں لیکن وصف غالب کے لحاظ سے ایک دوسرے سے ممتاز تھا۔ پہلا فرقہ اہل الروایۃ اور اہل حدیث اور دوسرا فرقہ مجتہد اور اہل الرائے کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ امام مالک، سفیان ثوری، اوزاعی اس لئے اہل الرائے کہلائے کہ وہ محدث ہونے کے ساتھ مجتہد مستقل اور بانی مذہب تھے ۔ لیکن چونکہ ان لوگوں میں بھی معلومات حدیث اور قوت اجتہاد کے لحاظ سے اختلاف مراتب تھا اس لئے

اہل الرائے کی تحقیق

جو لوگ اہل الرائے کے لقب سے پکارے گئے

اضافی طور پر کبھی کبھی اس فرقے میں سے ایک کو اہل الرائے اور دوسرے کو اہل حدیث کہتے تھے۔ مثلاً امام مالک کی بہ نسبت امام ابوحنیفہ پر مجتہد اور اہل الرائے کا لقب زیادہ موزوں تھا۔ امام حنبل رح سے ایک بار نضر نے پوچھا کہ آپ لوگوں کو امام ابوحنیفہ رح پر کیا اعتراض ہے؟ انھوں جواب دیا کہ "رائے"۔ نضر نے کہا کیا امام رائے پر عمل نہیں کرتے؟ امام احمد بولے کہ ہاں ابوحنیفہ رائے کو زیادہ دخل دیتے ہیں۔ نضر نے کہا حصہ رسدی کے موافق دونوں پر الزام آنا چاہیئے نہ صرف ایک پر۔ امام احمد حنبل رح کچھ جواب نہ دے سکے اور چپ ہو گئے۔

ف: امام صاحب کے اہل الرائے لقب سے مشہور ہونے کی وجہ

امام ابوحنیفہ رح سے پہلے فقہ کوئی مستقل اور مرتب فن نہ تھا۔ (امام صاحب نے اس کی تدوین کی طرف توجہ کی تو ہزاروں مسئلے ایسے پیش آئے جن میں کوئی حدیث صحیح بلکہ صحابہ کا قول بھی موجود نہ تھا اس لئے ان کو قیاس سے کام لینا پڑا۔ قیاس پر پہلے بھی عمل تھا خود صحابہ قیاس کرتے تھے اور اس کے مطابق فتوے دیتے تھے (اس کا مفصل حال آگے آئے گا) لیکن اس وقت تک تمدن کو چنداں وسعت حاصل نہ تھی، اس لئے نہ کثرت واقعات پیش آتے تھے نہ چنداں قیاس کی ضرورت پڑتی تھی۔ امام صاحب نے فقہ کو مستقل فن بنانا چاہا۔ قیاس کی کثرت استعمال کے ساتھ اس کے اصول وقواعد بھی مرتب کرنے پڑے۔ اس بات نے ان کو رائے اور قیاس کے انتساب سے زیادہ شہرت دی۔ چنانچہ تاریخوں میں جہاں ان کا نام لکھا جاتا ہے امام کو اہل الرائے لکھا جاتا ہے۔

ف: ایک اور وجہ

اس شہرت کی ایک اور وجہ ہوئی۔ عام محدثین حدیث و روایت میں درایت سے بالکل کام نہیں لیتے تھے۔ امام ابوحنیفہ نے اس کی ابتدا کی اور اس کے اصول وقواعد منضبط کئے۔ انھوں نے بہت سی حدیثیں اس بنا پر قبول نہ کیں کہ اصول درایت کے موافق ثابت نہ تھیں اس لئے اس لقب کو زیادہ شہرت ہوئی کیونکہ درایت اور رائے مترادف سے الفاظ ہیں اور کم از کم یہ کہ عام لوگ ان دونوں میں فرق نہ کر سکتے تھے۔

امام ابوحنیفہ بحیثیت امام حدیث ہونا

ان عارضی بحثوں کے بعد ہم اصل مسئلہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں یعنی یہ کہ امام ابوحنیفہ کو فنِ حدیث میں کیا رتبہ حاصل تھا۔ اس بحث کے فیصلے کے لئے ان کی زندگی کے واقعات پر نظر ڈالنی چاہیئے جو نہایت صحیح اور مستند روایتوں سے ثابت ہیں اس کتاب کے پہلے حصہ میں ہم امام ابوحنیفہ رح کی تحصیل حدیث کے حالات ان کتابوں کی سند سے لکھ آئے ہیں جن پر فن رجال کا دارومدار ہے۔ اب غور کرو کہ جس شخص نے بیس برس کی عمر سے جو فہم کی درستی اور پختگی کا زمانہ ہے علم حدیث پر توجہ کی ہو اور ایک مدت دراز تک اس شغل میں مصروف رہا ہو، جس نے کوفہ کے مشہور شیوخ حدیث سے حدیثیں سیکھیں ہوں، حرم محترم کی درسگاہوں میں برسوں تحصیل کرتا رہا ہو، جس کو مدینہ منورہ کے شیوخ نے سند فضیلت دی ہو، جس کے اساتذہ حدیث عطاء بن ابی رباح، نافع بن عمرؓ، عمرو بن دینار، محارب بن دثار، اعمش کوفی، امام باقرؓ، علقمہ بن مرثد، مکحول شامی، امام اوزاعی، محمد بن مسلم زہری، ابو اسحاق السبیعی، سلیمان بن یسار، عبدالرحمٰن بن ہرمز الاعرج، منصور المعتمر، ہشام بن عروہ وغیرہ ہوں جو فن روایت کے ارکان ہیں اور جن کی روایت سے بخاری و مسلم مالا مال، وہ حدیث میں کس رتبہ کا شخص ہوگا۔

اس کے ساتھ امام صاحب کے شاگردوں پر لحاظ کرو[1]۔ یحییٰ بن سعید القطان جو فنِ جرح و تعدیل کے امام ہیں، عبدالرزاق بن ہمام جن کے جامع کبیر سے امام بخاری نے فائدہ اٹھایا ہے، یزید بن ہارون جو امام احمد حنبل کے استاد تھے، وکیع الجراح جن کی نسبت امام احمد حنبل رح کہا کرتے تھے کہ حفظ اسناد و روایت میں میں نے ان کا ہمسر کسی کو نہیں دیکھا، عبداللہ بن مبارک جو فن حدیث میں امیر المومنین تسلیم کئے گئے ہیں، یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدہ جنہوں علی بن المدینی۔

(استادی مجازی) منتہائے علم کہلاتے تھے یہ لوگ برائے نام امام صاحب کے شاگرد نہ تھے بلکہ برسوں انکے دامن فیض میں تعلیم پائی تھی اور اس انتساب پر ان کو فخر و ناز تھا۔ عبداللہ بن المبارک کہا کرتے تھے کہ خدا نے ابوحنیفہ و سفیان ثوری

[1] ان لوگوں کا تذکرہ اس کتاب کے خاتمہ میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔

سے میری مدد نہ کی ہوتی تو میں ایک معمولی آدمی ہوتا۔ وکیع اور یحییٰ ابن ابی زائدہ امام صاحب کی صحبت میں اتنی مدت تک رہے تھے کہ صاحب ابی حنیفہ کہلاتے تھے۔ کیا اس رتبہ کے لوگ جو خود حدیث و روایت کے پیشوا اور مقتدا تھے کسی معمولی آدمی کے سامنے سر جھکا سکتے تھے۔

اجتہاد کی شرائط اور امام ابوحنیفہ رح کا مجتہد مطلق ہونا

اِن باتوں کے علاوہ امام ابوحنیفہ کا مجتہد مطلق ہونا ایک ایسا مسلّم مسئلہ ہے جس سے بارہ سو برس کی مدّت میں شاید ایک آدھ ہی شخص نے انکار کیا ہو۔ اجتہاد کی تعریف علماء حدیث مثلاً بغوی، رافعی، علامہ نووی وغیرہ نے ان لفظوں میں کی ہے۔ ”مجتہد وہ شخص ہے جو قرآن، حدیث، مذاہب سلف، لغت، قیاس ان پانچ چیزوں میں کافی دستگاہ رکھتا ہو، یعنی مسائل شرعیہ کے متعلق جسقدر قرآن میں آیتیں ہیں جو حدیثیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے ثابت ہیں جسقدر علم و لغت درکار ہے، سلف کے جو اقوال ہیں، قیاس کے جو طریق ہیں قریب کل کے کل جانتا ہو اگر ان میں سے کسی میں بھی کمی ہے تو وہ مجتہد نہیں ہے اور اس کو تقلید کرنی چاہیئے۔[1]

اسی بنا پر علامہ ابن خلدون نے فصل علوم الحدیث میں مجتہدین کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ بعض ناانصاف مخالفین کا قول ہے کہ ان مجتہدوں میں سے بعض فن حدیث میں کم مایہ تھے اس لئے ان کی روایتیں کم ہیں[2] لیکن یہ خیال غلط ہے۔ ائمۂ کبار کی نسبت یہ گمان نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ شریعت قرآن و حدیث سے ماخوذ ہے۔ پس جو شخص حدیث میں کم مایہ ہے اس کو تلاش اور کوشش کرنی چاہیئے تاکہ دین کو صحیح اصول سے اخذ کر سکے۔ اس کے بعد علامہ موصوف لکھتے ہیں کہ فن حدیث میں امام ابوحنیفہ رح کا کبار مجتہدین میں ہونا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کا مذہب محدثین میں

---

[1] تہذیب التہذیب ترجمہ امام ابوحنیفہ رح ۱۲ [2] عقد الجید شاہ ولی اللہ صاحب بحث حقیقت اجتہاد ۱۲ [3] اس تصریح ہوتے ہوئے بعض کوتاہ بینوں نے امام صاحب کی ناواقفیت حدیث پر ابن خلدون کے ایک ضمنی قول سے استدلال کیا ہے جس کو خود ابن خلدون نے ایسے لفظوں میں بیان کیا ہے جو ضعف اور عدم وثوق پر دلالت کرتا ہے۔ ۱۲

معتبر خیال کیا جاتا ہے اور رد اقبولاً اس سے بحث کی جاتی ہے۔ علامہ موصوف نے اس کا سبب بھی فرمایا ہے کہ امام ابو حنیفہ کی روایتیں کم کیوں ہیں۔ ہم خود اس کو مفصل لکھیں گے۔

محدثین میں بھی اکثروں نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ علامہ ذہبی نے جو زمانۂ مابعد کے تمام محدثین کے پیشوا اور امام ہیں حفاظ حدیث کے حالات میں ایک مستقل کتاب لکھی ہے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ یہ ان لوگوں کا تذکرہ ہے جو علم نبوی کے حامل ہیں اور جن کے اجتہاد پر توثیق اور تضعیف و تصحیح میں رجوع کیا جاتا ہے۔ علامہ موصوف نے تمام کتاب میں اس اصول کو ملحوظ رکھا ہے اور کسی ایسے شخص کا حال نہیں لکھا جو علم حدیث کا بڑا ماہر نہ ہو۔ چنانچہ خارجہ بن زید بن ثابت کا ضمناً ایک موقع پر ذکر آ گیا ہے تو لکھتے ہیں کہ میں نے ان کو حفاظ حدیث میں اس لئے ذکر نہیں کیا کہ وہ قلیل الحدیث تھے۔ امام ابوحنیفہ کے محدث ہونے کا اس سے زیادہ کیا ثبوت درکار ہے کہ علامہ ذہبی نے اس کتاب میں ان کا ترجمہ لکھا ہے اور ان کو حفاظ حدیث میں شمار کیا ہے۔

حافظ ابو المحاسن دمشقی شافعی نے عقود الجمان میں ایک خاص باب باندھا ہے جس کے یہ الفاظ ہیں الباب الثالث والعشرون فی بیان کثرۃ حدیثہ وکونہ من اعیان الحفاظ المحدثین (یعنی تیئیسواں باب اس بیان میں ہے کہ وہ (امام ابوحنیفہ رح) کثیر الحدیث اور اعیان الحفاظ کہتے تھے) قاضی ابو یوسف صاحب جن کو یحیٰی بن معین صاحب الحدیث کہتے تھے اور علامہ ذہبی نے ان کو حفاظ حدیث میں محسوس کیا ہے ان کا بیان ہے کہ ہم لوگ امام ابوحنیفہ سے مسائل پر بحث کرتے ہوتے تھے تو جب انکی رائے قائم ہو جاتی تھی تو میں حلقۂ درس سے اٹھ کر کوفہ کے محدثین کے پاس جاتا اور ان سے مسئلہ کے متعلق حدیثیں دریافت کر کے امام صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ امام صاحب ان حدیثوں میں سے بعض کو قبول کرتے تھے اور بعض کو فرماتے کہ صحیح نہیں۔ میں پوچھتا کہ آپ کو کیونکر معلوم

علامہ ذہبی نے امام ابوحنیفہ کو حفاظ حدیث میں محسوب کیا ہے

ہوا؟ فرماتے کہ کوفہ میں جو علم ہے میں اس کا عالم ہوں۔

یہ تمام باتیں اس بات کی شاہد ہیں کہ علم حدیث میں امام ابوحنیفہ کا کیا پایہ تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان باتوں نے امام ابوحنیفہ کو امام نہیں بنایا اگر وہ حافظ الحدیث تھے تو اور لوگ بھی تھے۔ اگر ان کے شیوخ حدیث کئی سو تھے تو ائمہ سلف کے شیوخ کئی کئی ہزار تھے۔ اگر انھوں نے کوفہ و حرمین کی درسگاہوں میں تعلیم پائی تھی تو اوروں نے بھی یہ شرف حاصل کیا تھا۔ امام ابوحنیفہ کو جس بات نے تمام ہمعصروں میں ممتاز کیا وہ اور چیز ہے جو ان سب باتوں سے بالاتر ہے لیکن احادیث کی تنقید اور بلحاظ ثبوت احکام ان کے مراتب کی تفریق امام ابوحنیفہ کے بعد علم حدیث کو بہت ترقی ہوئی۔ غیر مرتب اور پریشان حدیثیں یکجا کی گئیں صحاح کا التزام کیا گیا، اصول صحت کا مستقل فن قائم ہو گیا جس کے متعلق سینکڑوں بلکہ ہزاروں کتابیں تصنیف ہوئیں۔ زمانہ اس قدر ترقی کر گیا ہے کہ باریک بینی اور دقت آفرینی کی کوئی حد نہ رہی، تجربہ اور دقت کی نظر نے سینکڑوں نئے نکتے ایجاد کیے، لیکن تنقید احادیث، اصول درایت، امتیاز مراتب میں امام ابوحنیفہ کی تحقیق کی جو حد ہے آج بھی ترقی کا قدم اس سے آگے نہیں بڑھتا۔

اس اجمال کی تفصیل اس وقت سمجھ میں آسکتی ہے کہ فن حدیث کی آغاز اور طرز ترقی کا اجمالی نقشہ کھینچا جائے جس سے ظاہر ہو کہ روایتوں کا سلسلہ کیونکر پیدا ہوا اور کس کس دور میں اس کی کیا حالتیں بدلیں۔ اسی سے اس بات کا اندازہ ہو سکے گا کہ احادیث کی تنقید میں اجتہاد رائے کا کس قدر کام ہے اور امام ابوحنیفہ کو اس لحاظ سے اپنے ہم فنوں میں کیا خاص امتیاز حاصل ہے۔

اسناد و روایت کا سلسلہ اگرچہ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک ہی میں شروع ہو چکا تھا۔ لیکن اس وقت تک جسقدر تھا نہایت سادہ اور قدرتی صورت میں تھا۔ آغاز نبوت سے تیرہ سو برس کا زمانہ تو ایسا پُر آشوب زمانہ تھا کہ صحابہ کو اپنی جان کی پڑی تھی اسناد و روایت کا کہاں موقع تھا۔ اسی ضرورت سے احکام

و فرائض بھی کم تھے یعنی نماز کے سوا اور کچھ فرض نہ ہوا تھا۔ کیونکہ اس زحمت میں اور فرائض کی تکلیف "تکلیف مالایطاق" سے کم نہ تھی، نمازیں مختصر تھیں یعنی ظہر، عصر، عشاء سب میں صرف دو دو رکعتیں فرض تھیں۔ جمعہ و عیدین سرے سے مامور بہ نہ تھے۔ سنہ ۲ھ میں یعنی نبوت سے پندرھویں برس روزے فرض ہوئے، زکوٰۃ کی نسبت اختلاف ہے۔ علامہ ابن الاثیر نے لکھا ہے کہ سنہ ۹ھ میں نماز فرض ہوئی، حج کا حکم بھی اسی سن میں ہوا۔ غرض آغاز نبوت سے ایک مدت تک نماز کے سوا اور احکام صادر ہوئے تھے نہ ان کے متعلق حدیثیں اور روایتیں پیدا ہوئی تھیں۔ صحابہ مسائل و احکام کے متعلق زیادہ بازپرس نہیں کرتے تھے۔ خود قرآن میں حکم آچکا ہے لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ۔

عبداللہ بن عباسؓ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے رسول اللہؐ کے اصحاب سے کسی قوم کو بہتر نہیں سمجھا تمام زمانہ نبوت میں صرف تیرہ مسئلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھے جو سب قرآن میں مذکور ہیں[۱]۔ اور صحابہ سے بھی اسی قسم کے اقوال منقول۔ جو احکام و واقعات پیش آتے تھے ان میں بھی روایت کا سلسلہ کم جاری ہوا تھا۔ صحابہؓ خود رسول اللہؐ سے پوچھ لیا کرتے تھے اور واسطہ و روایت کی کم ضرورت پڑتی تھی۔ حدیثوں کے قلمبند کرنے کی اجازت نہ تھی۔ صحیح مسلم میں روایت ہے۔ لا تکتبوا عنی شیئاً الا القرآن ومن کتب عنی غیر القرآن فلیمحہ۔ رسولؐ کے بعد حضرت ابوبکرؓ کی خلافت شروع ہوئی۔ ابتدا ہی میں عرب کی بغاوت عام کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اس سے فارغ ہو کر روم و ایران کی مہمیں شروع ہو گئیں اور ان کی مختصر خلافت میں حدیثوں کی چنداں اشاعت نہ ہو سکی۔ حضرت عمرؓ نے ساڑے برس خلافت کی اور ملک میں نہایت امن و امان رہا۔ لیکن وہ دانستہ حدیثوں کی کثرت کو روکتے رہے۔ علامہ ذہبی نے طبقات الحفاظ میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ اس خوف سے کہ حدیث بیان کرنے والا رسول اللہؐ کی طرف غلط روایت منسوب نہ کر دے صحابہ کو ہمیشہ حکم دیتے تھے کہ حدیثیں کم روایت کریں[۲]۔ ایک بار انصار کے

---

[۱] مسند دارمی ۱۲ [۲] ترجمہ حضرت عمرؓ ۱۲ ۔

کے ایک گروہ کو کوفہ بھیجا۔ چلتے وقت ان سے فرمایا کہ تم لوگ کوفہ جا رہے ہو وہاں ایک قوم سے ملو گے جو بڑی رقت سے قرآن تلاوت کرتے ہیں۔ وہ تمہاری آمد سن کر مشتاق ہوں گے کہ رسول اللہؐ کے اصحاب آئے ہیں لیکن جب وہ تمہارے پاس آئیں اور حدیثیں سننی چاہیں تو زیادہ حدیثیں بیان نہ کرنا[1]۔ اسی طرح عراق کو صحابہ جانے لگے تو حضرت عمرؓ نے خود ان کی مشایعت کی اور ان سے پوچھا کہ "جانتے ہو میں کیوں تمہارے پاس آرہا ہوں؟ لوگوں نے کہا تکرِمَۃً عَلَیْنَا (یعنی ہماری عزت افزائی کے لئے) فرمایا کہ ہاں۔ لیکن اور مقصد ہے وہ یہ کہ جہاں جا رہے ہو وہاں لوگ اکثر قرآن کی تلاوت کیا کرتے ہیں ان کو حدیثوں میں نہ پھنسا لینا اور رسول اللہؐ سے کم روایت کرنا چنانچہ جب یہ لوگ قریظہ پہنچے تو لوگ یہ سن کر کہ صحابہؓ تشریف لائے ہیں زیارت کو آئے اور حدیثوں کی خواہش ظاہر کی۔ ان لوگوں نے اس بنا پر انکار کیا کہ حضرت عمرؓ نے منع کیا ہے[2] حضرت ابو ہریرہؓ سے ابو سلمہؓ نے پوچھا کہ آپ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اسی طرح روایت کیا کرتے تھے؟ بولے کہ نہیں ورنہ عمرؓ دُرّے مارتے۔

حضرت عثمانؓ و حضرت علیؓ کی مجموعی خلافت بیس اکیس برس تک رہی اس میں احادیث کی زیادہ اشاعت ہوئی۔ صحابہ دور دور تک پہنچ گئے تھے ضرورتیں بڑھتی جاتی تھیں نئے نئے مسئلے پیش آتے تھے ان اسباب نے حدیث و روایت کے سلسلے کو بہت وسعت دی۔ حضرت عثمانؓ کے اخیر زمانہ میں بغاوت ہوئی جس کا خاتمہ خلیفۂ وقت کی شہادت پر ہوا۔ اور یہ پہلا واقعہ تھا کہ جماعت اسلامی میں فرقہ بندیاں قائم ہوئیں۔ حضرت علیؓ کی خلافت شروع ہی سے پر آشوب رہی۔ ان اختلافات در حقیقت کیساتھ وضع احادیث کی ابتدا ہوئی اور اگرچہ کثرت اور انتشار زیادہ تر زمانہ مابعد میں ہوا لیکن خود صحابہ کے عہد میں اہل بدعت نے سینکڑوں ہزاروں حدیثیں ایجاد کر دی تھیں مقدمہ صحیح مسلم میں ہے کہ ایک بار بشیر عدوی حضرت عبد اللہ عباسؓ کے پاس آیا اور حدیث بیان کرنی شروع کی، انھوں نے کچھ خیال نہ کیا۔ بشیر نے کہا "ابن عباسؓ!

حدیثوں کا وضع کیا جانا

[1] مسند دارمی ۱۲ [2] طبقات الحفاظ ترجمہ عمر فاروقؓ ۱۲

میں رسول اللہؐ سے روایت کر رہا ہوں اور تم متوجہ نہیں ہوتے " فرمایا ایک زمانہ میں ہمارا یہ حال تھا کہ کسی کو قال رسول اللہؐ کہتے سنتے تھے تو فوراً ہماری نگاہیں اٹھ جاتی تھیں اور کان لگا کر سنتے تھے۔ لیکن جب سے لوگوں نے نیک و بد میں تمییز نہیں رکھی ہم صرف اُن حدیثوں کو سنتے ہیں جن کو ہم خود بھی جانتے ہیں "

زبانی روایت سے گزر کر تحریروں میں بھی جعل شروع ہو گیا تھا۔ مسلم نے روایت کی ہے کہ ایک دفعہ عبداللہ بن عباسؓ حضرت علیؓ کے ایک فیصلہ کی نقل لے رہے تھے بیچ میں الفاظ چھوڑتے جاتے اور کہتے تھے کہ واللہ علی نے ہرگز یہ فیصلہ نہیں کیا ہوگا۔ اسی طرح ایک اور دفعہ عبداللہ بن عباسؓ نے حضرت کی ایک تحریر دیکھی تو تھوڑے سے الفاظ کے سوا باقی سب عبارت مٹا دی۔

وضع حدیث اور روایت میں بے احتیاطی کے اسباب

لوگوں کو وضع حدیث کی زیادہ جرأت اس وجہ سے ہوتی تھی کہ اس وقت تک اسناد و روایت کا طریقہ جاری نہیں ہوا تھا جو شخص چاہتا تھا قال رسول اللہؐ کہہ دیتا تھا اور اثبات سند کے مواخذہ سے بری رہتا تھا۔ ترمذی نے کتاب العلل میں امام ابن سیرین سے روایت کی ہے کہ "پہلے زمانہ میں لوگ اسناد نہیں پوچھا کرتے تھے جب فتنہ پیدا ہوا تو اسناد کی پوچھ گچھ ہوئی تاکہ اہل سنّت کی حدیثیں لی جائیں اور اہل بدعت کی ترک کی جائیں لیکن حدیث کی بے اعتباری اہل بدعت پر موقوف نہ تھی اس لئے یہ احتیاط چنداں مفید نہ ہوئی اور غلطیوں کا سلسلہ برابر جاری رہا۔

بنو امیہ کا دور شروع ہوا اور بڑے زور شور سے حدیث نے ترویج پائی۔ صحابہ کی تعداد جس قدر کم ہوتی جاتی تھی اسی قدر ان کی قدر اور ان کی طرف التفات بڑھتا جاتا تھا، تمدّن میں بہت کچھ ترقی ہو گئی تھی۔ نئی نئی قومیں مسلمان ہوتی جاتی تھیں ان نومسلموں کو ادہر تو اسلام کا نیا نیا جوش تھا اور ہر قوم فاتح کے مجمع میں عزت و اثر پیدا کرنے کی اس سے بڑھ کر کوئی تدبیر نہ تھی۔ ان باتوں نے ان کو معلومات مذہبی کا اس قدر شائق بنا دیا تھا کہ خود عرب، ان کی ہمسری کا دعویٰ

نہیں کرسکتے تھے ۔ غرض تمام ممالک اسلامیہ میں گھر گھر حدیث اور روایت کے چرچے پھیل گئے اور سینکڑوں ہزاروں درسگاہیں قائم ہو گئیں ۔ لیکن جسقدر اشاعت کو وسعت ہوتی جاتی تھی اعتماد اور صحت کا معیار کم ہوتا جاتا تھا۔ ارباب روایت کا دائرہ اسقدر وسیع تھا کہ اس میں مختلف خیال، مختلف عادات، مختلف عقائد مختلف قوم کے لوگ شامل تھے ۔ اہل بدعت جابجا پھیل گئے تھے اور اپنے مسائل کی ترویج میں مصروف تھے ۔ سب سے زیادہ یہ کہ پوری ایک صدی گزر جانے پر بھی کتاب کا طریقہ مروّج نہیں ہوا تھا ۔ ان اسباب سے روایتوں میں اس قدر بے احتیاطیاں ہوئیں کہ موضوعات اور اغالیط کا ایک دفتر بے پایاں تیار ہو گیا یہاں تک کہ امام بخاری رح نے اپنے زمانے میں صحیح حدیثوں کو جدا کرنا چاہا تو کئی لاکھ میں سے انتخاب کر کے جامع صحیح لکھی جس میں کل ۷،۲۹۷ حدیثیں ہیں ۔ اس میں بھی اگر مکررات نکال ڈالی جائیں تو صرف ۲،۷۶۱ حدیثیں باقی رہتی ہیں ۔ سینکڑوں ہزاروں بلکہ لاکھوں حدیثیں لوگوں نے نعوذ النسۃ وضع کر لیں ۔ حماد بن زید کا بیان ہے کہ چودہ ہزار حدیثیں صرف ایک فرقہ زنادقہ نے وضع کر لیں ۔ عبد الکریم وضاع نے خود تسلیم کیا تھا کہ چار ہزار حدیثیں اس کی موضوعات سے ثقات اور پارسا لوگوں نے روایت کیں جو نیک نیتی سے فضائل اور ترغیب میں حدیثیں وضع کرتے تھے ۔ حافظ زین الدین عراقی لکھتے ہیں کہ ان حدیثوں نے بہت ضرر پہنچایا کیونکہ ان واضعین کی تقشف اور تورع اور زہد کی وجہ سے یہ حدیثیں اکثر مقبول ہو گئیں اور رواج پا گئیں ۔

وضع کے بعد مساہلات غلط فہمیاں بے احتیاطیاں کا درجہ تھا جن کی وجہ سے ہزاروں اقوال رسول اللہ ص کی طرف بے قصد منسوب ہو گئے ۔ بعض محدثین کا قاعدہ تھا کہ حدیث کے ساتھ حدیث کی تفسیر بھی بیان کرتے جاتے تھے اور اکثر حروف تفسیر حذف کر دیتے تھے جس سے سامعین کو دھوکا ہوتا تھا اور ان کے تفسیری جملوں کو بھی حدیث مرفوع سمجھ لیتے تھے ۔ تعجب یہ ہے کہ اس قسم کے مسامحات بڑے بڑے ائمہ فن سے صادر ہوئے امام زہری جو امام مالک کے استاد اور حدیث کے ایک بڑے

رکن تھے ان کی نسبت علامہ سخاوی لکھتے ہیں وکذلک کان الزہری یفسر الحدیث کثیرا وربما اسقط اداۃ التفسیر (یعنی اسی طرح زہری اکثر حدیث کی تفسیر کرتے تھے اور وہ حروف جن سے اس عبارت کا تفسیر ہونا ظاہر ہو چھوڑ دیا کرتے تھے)۔" وکیع کا بھی یہی حال تھا وہ اکثر حدیث کے بیچ بیچ میں "یعنی" کہہ کر مطلب بیان کرتے جاتے تھے اور اکثر "یعنی" کا لفظ چھوڑ دیتے تھے جس سے سامعین کو اشتباہ ہوتا تھا۔ کتب رجال و اصول حدیث میں اس قسم کی اور بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔

بڑی آفت تدلیس کی تھی جس کا ارتکاب بڑے بڑے ائمہ فن کرتے تھے اس تدلیس نے اسناد کے اتصال کو بالکل مشتبہ کر دیا تھا' ان کے سوا اور بہت سی بے احتیاطیاں تھیں جن کی تفصیل حدیث کی کتابوں میں مل سکتی ہے۔

غرض امام ابوحنیفہؒ کے زمانے میں جو احادیث کا دفتر تیار ہو چکا تھا ہزاروں موضوعات' اغالیط' ضعاف' مارجات سے بھرا ہوا تھا' اس وقت امام بخاری و مسلم نہ تھے جو صحیح حدیثوں کے انتخاب کی کوشش کرتے۔ امام ابوحنیفہ گو مہمات فقہ کی وجہ سے اس طرف متوجہ نہ ہو سکے تاہم انھوں نے روایتوں کی تنقید کی بنیاد ڈالی اور اس کے ضوابط قرار دیے۔ ان کے اصول تنقید نہایت سخت خیال کیے گئے یہاں تک کہ محدثین نے ان کو متشدد فی الروایت کا لقب دیا ہے تمام اور محدثین کی بہ نسبت امام صاحب کے قلیل الروایۃ ہونے کی ایک یہ بھی وجہ ہے بلکہ تمام اور وجوہ کی نسبت یہ زیادہ قوی سبب ہے۔ علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں۔ والامام ابوحنیفۃ انما قلت روایتہ لما شدد فی شروط الروایۃ والتحمل (یعنی امام ابوحنیفہ کی روایتیں اس لیے کم ہیں کہ انھوں نے روایت اور تحمل کی شرطوں میں سختی کی) حدیث کے متعلق پہلا اجمالی خیال جو امام صاحب کے دل میں پیدا ہوا وہ یہ تھا کہ بہت کم حدیثیں ہیں جن کی صحت کا کافی ثبوت موجود ہے۔ یہ صدا اگرچہ جدت کی وجہ سے کسی قدر نامانوس صدا تھی اور اسی وجہ سے بعض بعض ارباب حدیث نے نہایت سخت مخالفت کی لیکن

امام صاحب کا خیال تھا کہ بہت کم حدیثیں صحیح ہیں۔

امام صاحب اس خیال پر مجبور بلکہ معذور تھے انھوں نے یہ رائے مقلدانہ نہیں قائم کی تھی۔ وہ اپنے زمانے کے اکثر شیوخ سے ملے تھے اور ان کے سرمایہ حدیث سے متمتع ہوئے تھے۔ حرمین کی بڑی بڑی درسگاہوں میں برسوں تعلیم پائی تھی۔ کوفہ، بصرہ، حرمین میں ارباب روایت کا جو گروہ موجود تھا برسوں کے تجربے سے ان کے ذاتی اوصاف اخلاق و عادات پر اطلاع حاصل کی تھی۔ غرض اس مسئلہ کے متعلق اثباتاً یا نفیاً مجتہدانہ رائے قائم کرنے کے لئے جو شرطیں درکار تھیں سب ان میں موجود تھیں۔

ف اس خیال کا ایک بڑا سبب

اس خیال کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ یہ مسئلہ کسی نہ کسی پیرایہ میں ان کے خاندان تعلیم میں وراثۃً چلا آتا تھا۔ حدیث فقہ میں ان کے خاندان تعلیم کے مورث اول عبداللہ بن مسعودؓ ہیں اور مذہب حنفی کی بنیاد زیادہ تر انھیں کی روایات و استنباطات پر ہے۔

عبداللہ بن مسعودؓ اگرچہ بہت ہی بڑے محدث تھے لیکن اور محدثین صحابہؓ کی نسبت قلیل الروایۃ تھے جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ متشدد اور محتاط تھے، علامہ ذہبی ان کے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ کان ممن یتحری فی الاداء ویشدد فی الروایۃ وکان یقلل من الروایۃ فی الحدیث (یعنی عبداللہ بن مسعودؓ ادا میں تحری اور روایت میں تشدد کرتے تھے اور حدیث میں کم روایت کرتے تھے۔ ابراہیم نخعی جو عبداللہ بن مسعودؓ کے بہ یک واسطہ شاگرد اور امام ابوحنیفہ کے بہ یک واسطہ شاگرد اور امام ابوحنیفہ کے واسطہ استاد تھے ان کا بھی یہی مذہب تھا اور اسی وجہ سے وہ صیرفی الحدیث کہلاتے تھے۔ امام ابوحنیفہ نے گو اور بہت سی درسگاہوں میں تعلیم پائی تھی لیکن ان کی معلومات اور خیالات کا اصلی مرکز یہی خاندان تھا یہ ہی خاندانی اثر تھا جس نے ان کے دل میں یہ خیال پیدا کیا اور اس کو ان کے ذاتی تجربہ اور دقت نظر اور بھی قوت دی۔

امام صاحب کے اس خیال نے اگرچہ قبول عام کی سند حاصل نہیں کی تاہم وہ بالکل بے اثر نہیں رہا۔ امام مالک و امام شافعی جو اجتہاد میں

امام ابو حنیفہؒ سے متاخر ہیں، ان کے اصول اجتہاد میں اس خیال کا صاف پرتو پایا جاتا ہے۔ امام مالکؒ نے روایت کے متعلق جو قید اور شرطیں لگائی ہیں وہ امام ابو حنیفہ کی شرائط کے قریب قریب ہیں اور یہی وجہ ہے کہ متشددین فی الروایۃ میں ابو حنیفہؒ و امام مالکؒ کا نام ساتھ ساتھ لیا جاتا ہے۔ ابن الصلاح مقدمہ لکھتے ہیں ومن مذاہب التشدید مذہب من قال لا حجۃ الا فیما رواہ الراوی من حفظہ وتذکرہ وذلک مروی عن مالک وابی حنیفۃ (یعنی متشددین کا یہ مذہب ہے کہ صرف وہ حدیث قابل حجت ہے کہ جس کو راوی نے اپنی حفظ سے یاد رکھا ہو۔ اور یہ قول امام مالکؒ و امام ابو حنیفہؒ سے منقول ہے محدثین نے یہ لکھا ہے کہ امام مالکؒ نے اول جب موطا لکھی تو اس میں دس ہزار حدیثیں تھیں پھر امام مالکؒ نے زیادہ تحقیق کرتے گئے تو یہ تعداد کم ہوتی ہو گئی۔ یہاں تک کہ چھ سات سو رہ گئیں۔ امام شافعی نے صاف لفظوں میں امام ابو حنیفہؒ کے خیالات ظاہر کئے ہیں امام بیہقی نے روایت کی ہے کہ ایک دن ہرم قرشی نے امام شافعی سے کہا کہ آپ وہ حدیثیں لکھوائیے جو رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ ارباب معرفت کے نزدیک صحیح حدیثیں کم ہیں۔ کیونکہ ابو بکر صدیق رضؓ نے جو حدیثیں رسول اللہ ﷺ سے روایت کی ہیں انکی تعداد سترہ سے زیادہ نہیں ہے۔ عمر بن الخطابؓ باوجود اس کے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد مدت تک زندہ رہے ان کی روایت سے پچاس حدیثیں بھی ثابت نہیں۔ حضرت عثمانؓ کا بھی یہی حال ہے۔ حضرت علیؓ اگرچہ لوگوں کو حدیث سیکھنے کی ترغیب دلاتے تھے لیکن ان سے بھی کم حدیثیں مروی ہیں کیونکہ وہ مطمئن نہیں رہے۔ ان سے جو حدیثیں مروی ہیں اکثر حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت کی ہیں ان لوگوں کے سوا اور صحابہ سے بھی بہت سی حدیثیں مروی ہیں۔ لیکن اہل معرفت کے نزدیک وہ تمام روایتیں صحیح سند سے ثابت نہیں[1]۔ ان باتوں سے یہ سمجھنا چاہیئے کہ امام ابو حنیفہؒ معتزلیوں کی طرح احادیث کے منکر تھے یا صرف دس بیس حدیثوں کو تسلیم

امام مالک کی اور امام ابو حنیفہ کی شرط روایت قریب قریب متحد ہیں

---

[1] مناقب الشافعی از امام رازی فصل ثامن شرح مذہب الشافعی ۱۲

کرتے تھے۔ ان کے شاگردوں نے خود ان سے سینکڑوں حدیثیں روایت کی ہیں۔ موطا امام محمد، کتاب الآثار، کتاب الحجج جو عام طور پر متداول ہیں ان میں بھی امام صاحب سے بیسیوں حدیثیں مروی ہیں البتہ محدثین کی نسبت ان کی احادیث مسلسل کی تعداد کم ہے اور اس کی وجہ وہی مشروط روایت کی سختی ہے۔ امام صاحب نے روایت کے متعلق جو شرطیں اختیار کیں کچھ تو وہی ہیں جو اور محدثین کے نزدیک مسلّم ہیں کچھ ایسی ہیں جو منفرد ہیں یا صرف امام مالک اور بعض مجتہدین ان کے ہم زبان ہیں۔ ان میں سے ایک مسئلہ ہے کہ "صرف وہ حدیث حجت ہے جس کو راوی نے اپنے کانوں سے سنا ہو اور وہ روایت کے وقت یاد رکھا ہو"۔ یہ قاعدہ بظاہر نہایت صاف ہے جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا لیکن اس کی تفریعیں نہایت وسیع اثر رکھتی ہیں اور عام محدثین کو ان سے اتفاق نہیں ہے۔ محدثین کے نزدیک ان پابندیوں سے روایت کا دائرہ تنگ ہو جاتا ہے اور اس سے ہم کو بھی انکار نہیں۔ لیکن اس کا فیصلہ ناظرین خود کر سکتے ہیں کہ احتیاط مقدم ہے یا روایت کی وسعت؟ ہم بعض تفریعات کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ ذکر کرتے ہیں جس سے ظاہر ہوگا کہ امام ابو حنیفہ رح کو کس خیال نے اس قسم کی سختیوں پر مجبور کیا تھا۔

امام مالک نے روایت کے لئے کیا شرطیں مقرر کیں۔

اکثر شیوخ کا حلقۂ درس نہایت وسیع ہوتا تھا یہاں تک کہ ایک ایک مجلس میں دس دس ہزار سامعین جمع ہوتے تھے۔ اس وقت متعدد مستملی یعنی نائب جا بجا بٹھائے جاتے تھے کہ شیخ کے الفاظ کو دور والوں تک پہنچائیں۔ بہت سے ایسے لوگ ہوتے تھے جن کانوں میں شیخ کا ایک لفظ بھی نہیں پہنچتا تھا وہ صرف مستملی کے الفاظ سن کر حدیث روایت کرتے تھے۔ اب بحث پیدا یہ ہوتی ہے کہ جس شخص نے صرف مستملی سے سنا وہ اصل شیخ کی نسبت حدّثنا کہہ سکتا ہے یا نہیں۔ اکثر ارباب روایت کا مذہب ہے کہ کہہ سکتا ہے۔ امام ابو حنیفہ رح اس کے خلاف ہیں۔ ائمہ محدثین میں سے حافظ ابو نعیم فضل بن وکیع، زائد بن قدامہ امام صاحب کے ہم زبان ہیں[1]۔ حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ مقتضائے عقل بھی (امام) ابو حنیفہ کا مذہب ہے لیکن عام مذہب میں آسانی ہے۔

امام ابو حنیفہ رح کو اس احتیاط پر جس چیز نے مجبور کیا تھا وہ یہ تھی کہ ان کے

---

[1] فتح المغیث صفحہ 171

زمانہ تک روایت بالمعنیٰ کا طریقہ نہایت عام تھا اور بہت لوگ تھے جو الفاظ حدیث کی پابندی کرتے تھے اس لئے روایت میں تغیر و تبدل کا احتمال ہر واسطہ میں بڑھ جاتا تھا۔ کم از کم یہ کہ ہر روایت پہلے واسطہ میں جس قدر قوی ہوتی تھی دوسرے واسطہ میں اس کا پایہ نہیں قائم رہ سکتا تھا۔ بے شبہ مستملی کے مقرر کرنے کا طریقہ قائم رکھنا ضرور تھا۔ کیونکہ اکثر موقعوں پر بغیر مستملی کے کام نہیں چل سکتا تھا۔ لیکن ناانصافی تھی کہ جس شخص نے بلاواسطہ شیخ سے سنا ہو اور جس نے مستملی سے روایت کی ہو دونوں کا ایک ہی درجہ قرار دیا جائے۔ مستملی کبھی کبھی غافل اور بے سمجھ ہوتے تھے اس لئے غلطیوں کا احتمال اور بھی قوی ہو جاتا تھا۔

أخبرنا وحدثنا کے مفہوم کی وسعت

اس طرح بلکہ اس سے زیادہ غیر محتاط طریقہ یہ تھا کہ أَخْبَرَنَا وَحَدَّثَنَا کو بعض بعض محدثین عام معنوں میں استعمال کرتے تھے امام حسن بصری رح نے متعدد روایتوں میں لکھا ہے حَدَّثَنَا أَبُوهُرَيْرَةَ حالانکہ وہ ابوہریرہ رض سے کبھی نہیں ملے تھے۔ انھوں نے اس کی یہ تاویل کی تھی کہ ابوہریرہ رض نے جب وہ حدیث بیان کی تھی تو اس شہر میں وہ موجود تھے، اسی اور شیوخ صحابہ کی نسبت حَدَّثَنَا کا لفظ استعمال کرتے تھے اور معنی یہ لیتے تھے کہ ان کے شہر والوں نے ان شیوخ سے سنا تھا۔ محدث بخاری نے لکھا ہے کہ حسن بصری رح نے ان لوگوں سے روایت کی ہے جن سے وہ کبھی نہیں ملے۔ اور تاویل یہ کرتے تھے کہ ان کی قوم نے وہ حدیث اُن لوگوں سے سُنی تھی " یہ امر علاوہ اس کے کہ ایک قسم کی غلط بیانی تھی حدیث کی روایت کو مشتبہ کر دیتا تھا کیونکہ راوی نے جب خود شیخ سے حدیث نہیں سنی تو بیچ میں کوئی واسطہ ہوگا۔ اور چونکہ راوی نے اس کا نام کبھی نہیں بتایا اس لئے اس کے ثقہ ہونے کا حال نہیں معلوم ہو سکتا صرف حُسنِ ظن پر مدار رہ گیا کہ ایسے شخص نے جس سے سُنا ہوگا وہ ضرور قابل استناد ہوگا۔ امام ابوحنیفہ نے اس طریقہ کو ناجائز قرار دیا۔ اور ان کے بعد ائمہ حدیث نے بھی ان کی متابعت کی۔ ارباب روایت کا ایک طریقہ یہ تھا کہ جب کسی

اجزاء سے روایت

شخص سے کچھ حدیثیں سنیں اور قلمبند کر لیں تو ان اجزاء سے روایت کرنی ہمیشہ جائز سمجھتے تھے۔ اس کو اس قدر وسعت دی گئی کہ گو راوی کو ان حدیثوں کے الفاظ و معانی کچھ یاد

نہ رہے ہوں تاہم اس بنا پر کہ اجزا اس کے پاس موجود ہیں ان کی روایت کر سکتا ہے۔
امام ابوحنیفہؒ نے اس طریقہ کو قائم رکھا۔ لیکن یہ قید لگائی کہ حدیث کے "مطالب" محفوظ
ہونے چاہئیں ورنہ روایت جائز نہیں۔

یہ مسئلہ بھی اگرچہ عام طور پر تسلیم نہیں کیا گیا تاہم جیسا کہ محدث سخاوی نے تصریح
کی ہے امام مالک اور بہت سے ائمہ فن نے اس کی موافقت کی۔ امام بخاری و مسلم وغیرہ کے
زمانہ میں اس قید کی چنداں ضرورت نہیں رہی تھی کیونکہ اس وقت روایت کا باللفظ
کا عام رواج ہو چکا تھا۔ لیکن ابوحنیفہ کے عہد تک حدیثیں زیادہ تر بالمعنی روایت
کی جاتی تھیں۔ اس لئے اگر راوی کو الفاظ حدیث موقع حدیث شان نزول وغیرہ
یاد نہیں ہوتے تھے تو روایت کا بعینہا ادا کرنا قریباً ناممکن ہوتا تھا۔ اسی ضرورت سے
امام ابوحنیفہ نے اس طریقہ کو محدود کر دیا اور انصاف یہ ہے کہ ایسا کرنا ضروری تھا۔

سب سے زیادہ مہتم بالشان اور قابل بحث یہ مسئلہ ہے کہ روایت بالمعنی جائز ہے یا نہیں؟
یا یہ کہ ایسی روایت قطعاً قابل حجت ہے یا نہیں؟ یہ مسئلہ ہمیشہ مختلف فیہ رہا ہے اور اب بھی
ہے۔ امام شافعی نے روایت کی ہے کہ بعض تابعین نے ایک حدیث متعدد صحابہ سے سنی
جبکہ سب نے مختلف لفظوں میں بیان کیا لیکن مطلب ایک تھا۔ انھوں نے کسی صحابی
سے یہ حقیقت بیان کی۔ صحابی نے جواب دیا کہ "جب معنی مختلف نہیں تو کچھ مضائقہ
نہیں"۔ اگرچہ امام شافعی نے تابعی کا نام نہیں بتایا جس سے روایت کی قوت اور ضعف
کا اندازہ ہو سکتا تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ بعض صحابہ روایت بالمعنی جائز سمجھتے
تھے اور اس پر عمل کرتے تھے۔ بخلاف اس کے بعض صحابہ مثلاً عبداللہ بن مسعودؓ کو روایت
باللفظ پر اصرار تھا۔ علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کے حالات کے ذیل میں لکھتے
ہیں کہ وہ روایت میں سختی کرتے تھے۔ الفاظ کے ضبط میں بے پروائی نہ کریں۔ عبداللہ بن
مسعودؓ جب کبھی بالمعنی روایت کرتے تھے تو ساتھ ہی ساتھ یہ الفاظ استعمال کرتے تھے
اَوْمِثْلَہٗ اَوْشِبْہَہٗ اِمَّا فَوْقَ ذٰلِکَ وَاِمَّا دُوْنَ ذٰلِکَ وَاِمَّا قَرِیْبٌ مِّنْ ذٰلِکَ
یعنی رسول اللہؐ نے اس طرح فرمایا تھا یا اس کے مثل یا اس کے مشابہ یا اس سے کچھ زیادہ

یا کم یا اس کے قریب فرمایا تھا۔ ابو درداءؓ کا بھی یہی حال تھا وہ حدیث بیان کرکے کہا کرتے تھے ھذا ا۔ نحو ھذا۔ و شکل۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جو روایت سے منع کیا کرتے تھے ان کا بھی غالباً یہی منشار تھا، وہ جانتے تھے کہ الفاظ کم یا حدرہ سکنے اور معنی کی عام اجازت میں تغیر و تبدل کا احتمال بڑھتا جاتا ہے۔

صحابہؓ کے دور کے بعد بھی یہ مسئلہ یکسو نہ ہوا، تابعین کے دو گروہ اور خود امام ابوحنیفہؒ کے استاد الاستاد روایت بالمعنی کے قائل تھے۔ آگے چل کر تو گویا اس پر اتفاق عام ہو گیا کہ روایت بالمعنی جائز ہے۔ چنانچہ اصول حدیث کی کتابوں میں جمہور کا یہی مذہب بیان کیا جاتا ہے۔ مجتہدین میں سے حضرت امام مالک اس کے خلاف ہیں محدثین کا ایک گروہ جن میں امام مسلم، قاسم محمد، محمد بن سیرینؒ، رجار بن حیوہ ابو زرعہ، سالم بن ابی الجعد، عبدالملک بن عمر داخل ہیں۔ روایت باللفظ پر عمل کرتا تھا۔ لیکن عام محدثین جواز ہی کے قائل ہیں اور در حقیقت ایک ایسا فرقہ جس کا عام میلان ہر حالت میں کثرت روایت کی طرف ہو جواز ہی کا قائل ہو سکتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ اکثر تابعین اور صحابہ نے بالمعنیٰ حدیثیں روایت کیں اور اگر شروع سے یہ قید لگائی جائے تو روایت کا دائرہ اس قدر تنگ ہو جاتا ہے کہ مسائل و احکام کے لئے کچھ باقی نہیں رہتا۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ روایت بالمعنی میں اصل روایت کا اصلی حالت پر قائم رکھنا اس قدر مشکل ہے کہ قریباً ناممکن ہے۔ زبان کے نکتہ شناس جانتے ہیں کہ مرادف الفاظ بھی یکساں اثر نہیں رکھتے اور معنی کی حیثیتوں میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور پیدا ہوتا ہے، حالانکہ مجوزین نے مرادف وغیرہ کی بھی قید نہیں رکھی اور ادائے مطلب کو نہایت عام وسعت دی ہے۔ صحابہ سے زیادہ کوئی شخص رسول اللہؐ کے الفاظ و مطالب کا اندازہ داں نہیں ہو سکتا تھا۔ اوّل تو وہ زباں داں اور زبان کے حاکم تھے۔ اس کے ساتھ شرف صحبت کی وجہ سے رسول اللہؐ کی طرز ادا طریقۂ گفتگو، انداز کلام، نحوائے سخن سے خوب واقف تھے تاہم کتب حدیث میں اس کی متعدد نظیریں ملتی ہیں کہ خود صحابہ سے ادائے مطلب میں کمی زیادتی ہو گئی۔

ابن ماجہ میں روایت ہے کہ ابوموسیٰ اشعری رض نے آنحضرت ص سے روایت کی کہ اِنّ المیت لیعذب ببکاء الحی اذا قال واعضداہ واکاساہ وانا صراہ واجبلاہ (یعنی جب مردہ پر یہ الفاظ کہہ کے رویا جاتا ہے تو اس کو عذاب دیا جاتا ہے" کسی نے حضرت عائشہ رض سے کہا کہ ابن عمر یہ حدیث بیان کرتے تھے حضرت عائشہ رض نے کہا میں یہ نہیں کہتی کہ ابن عمر رض جھوٹ کہتے ہیں - لیکن ان کو سہو ہوا - واقعہ یہ ہے کہ ایک یہودی عورت مر گئی، اس کے گھر والے اس پر روتے تھے - آنحضرت ص نے فرمایا اس کے گھر والے رو رہے ہیں اور اس پر قبر میں عذاب ہو رہا ہے - ایک اور روایت ہے کہ حضرت عائشہ رض نے قرآن کی یہ آیت پڑھی وَلا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ اُخْرٰی جس سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ ایک شخص کے فعل کا دوسرا ذمہ دار نہیں ہو سکتا گھر والے روتے ہیں تو ان کا قصور - مرنے والے نے کیا گناہ کیا ہے کہ اس پر عذاب کیا جائے - دیکھو اس حدیث میں رسول اللہ ص نے یہودیہ عورت کا معذب ہونا بطور ایک واقعہ بیان کیا تھا - راوی نے کو اس کا سبب قرار دیا اور حدیث کے یہ الفاظ بیان کئے کہ ان المیت لیعذب ببکاء الحی (یعنی مردہ کو زندوں کے رونے کی وجہ سے عذاب دیا جاتا ہے) - اسی طرح غزوہ بدر کے واقعہ میں عام روایت یہ ہے کہ رسول اللہ ص نے قلیب پر کھڑے ہو کر فرمایا هَلْ وَجَدْتُمْ مَا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا - لوگوں نے عرض کی کہ آپ مُردوں سے خطاب فرماتے ہیں - ؟ ارشاد ہوا " جو میں نے کہا ان لوگوں نے سُن لیا " لیکن یہ واقعہ حضرت عائشہ رض کے سامنے بیان کیا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ص نے یہ نہیں فرمایا تھا بلکہ یہ الفاظ فرمائے تھے لقد علموا ان ما دعوتھم حق (یعنی لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ جس چیز کی میں نے دعوت کی تھی وہ حق ہے) دیکھو ان دونوں جملوں کے مفہوم میں کس قدر فرق ہے اور اس سے سماع موتیٰ کے مسئلہ پر کیسا مختلف اثر پڑتا ہے - غرض جب صحابہ سے اس قسم کے مسامحات واقع ہوتے تھے تو دوسرے اور تیسرے دور کا کیا ذکر ہے - لطف یہ ہے کہ جو لوگ روایت بالمعنیٰ کے قائل ہیں انھوں نے چند الفاظ مثلاً اَبنائے کہ " ان کو دوسرے

لفظوں میں اس طرح ادا کر سکتے ہیں اور معنی میں مطلق فرق نہ ہوگا۔" حالانکہ غور سے دیکھئے تو ان لفظوں کے اثر میں صاف تفاوت نظر آتا ہے۔ محدّث سخاوی کہتے ہیں کہ حدیث میں آیا ہے "اقتلوا الاسودین الحیة والعقرب"۔ اب بجائے اس کے یہ کہہ سکتے ہیں کہ "امر بقتلهما"۔ محدّث سخاوی کے نزدیک اس مثال میں الفاظ کے اختلاف نے معنی میں کچھ فرق پیدا نہیں کیا حالانکہ "اقتلوا" اور "امر بالقتل" میں صریح تفاوت ہے "اقتلوا" اگرچہ امر کا صیغہ ہے لیکن اس میں وہ تحتّم اور تاکید نہیں ہے جو امر میں ہے۔

امام ابوحنیفہؒ نے ان مشکلات کا اندازہ کرکے نہایت معتدل طریقہ اختیار کیا۔ جو حدیثیں ان کے زمانے سے پہلے بالمعنی روایت ہو چکی تھیں اور محدثین میں شائع تھیں ان کے قبول سے تو چارہ نہ تھا ورنہ روایت کا تمام دفتر بیکار ہو جاتا اس لئے امام صاحب نے ان حدیثوں کو قبول کیا، لیکن یہ قید لگائی کہ "رُواتِ حدیث فقیہ ہوں یعنی الفاظ کے اثر اور مطالب کی تعبیر سے واقف ہوں"۔ تغیر مطالب کا احتمال اب بھی باقی رہتا ہے۔ لیکن احادیث کا مدار جیسا کہ محدثین نے تصریح کردی ہے ظن غالب پر ہے اس لئے جب تک کوئی مخالف دلیل موجود نہ ہو روایت بالمعنی قابل عمل ہوگی۔ امام صاحب نے ان احادیث کو بھی قبول کیا جن کے رُواۃ ثقہ ہوں اور فقیہ نہ ہوں اور فقیہ ہوں۔ لیکن ان کا درجہ پہلے کی بہ نسبت کم قرار دیا اور ان میں اصول درایت کی زیادہ ضرورت سمجھی۔ امام صاحب کے ان اصول سے اور ائمہ نے بھی اتفاق کیا الفیۃ الحدیث میں ہے کہ "جو شخص مدلول الفاظ کو اچھی طرح نہیں سمجھتا اسکو روایت باللفظ ضروری ہے۔ البتہ جو شخص مطالب کا اندازہ داں ہے اس کی نسبت اختلاف ہے کثرت رائے اس طرف ہے کہ وہ الفاظ کا پابند نہیں"۔ لیکن امام حنیفہؒ نے اس اجازت کو صحابہ اور تابعین تک محدود کر دیا لوگوں کے لئے روایت بالالفاظ کی قید لگائی اور امام طحاوی نے بسند متصل ان سے روایت کی ہے کہ صرف وہ حدیث روایت کرنی چاہیئے جو روایت کرنے کے وقت اسی طرح یاد ہو جس طرح سننے کے وقت یاد تھی۔ ملا علی قاری

ابو حنیفہ کے اصول

ـــــ تاریخ کبیر علامہ جعفر جریری طبری صفحہ ۱۳۴۲ ـ

نے اس روایت کو نقل کر کے لکھا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ رح روایت بالمعنی کو جائز نہیں رکھتے تھے" اس پابندی میں اگرچہ امام مالک اور بعض محدثین نے امام ابوحنیفہ رح سے اتفاق کیا۔ فتح المغیث میں ہے وقیل لاتجوزله الدوایتہ بالمعنے مطلقاً قال طائفة من المحدثین والفقهاء والاصولیین من الشافعیة وغیرهم قال القرطبی وهو الصحیح من مذهب مالک[1]۔
لیکن عام ارباب روایت اس سختی کے کیونکر پابند ہو سکتے تھے۔ چنانچہ ایک بڑے فرقہ نے مخالفت کی اور امام صاحب کو متشدد فی الروایۃ ٹھہرایا۔ تاہم انصاف یہ ہے کہ جو اصول امام صاحب نے اختیار کیا وہ ضروری اور نہایت ضروری تھا۔ خود حدیث میں آیا ہے نضر الله امرءً سمع منا شیئاً فبلغه کما سمعه یعنی رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ خدا اس شخص کو شاداب کرے جس نے ہم سے سنا اور اس کو اسی طرح پہنچایا جیسا کہ ہم سے سنا تھا" اس سے زیادہ اس باب میں کسی دلیل کی کیا ضرورت ہے۔ صحابہ میں سے جو لوگ روایت باللفظ کو غیر ضروری سمجھتے تھے ممکن ہے کہ یہ حدیث ان کو نہ پہنچی ہو۔ چنانچہ جن صحابہ کی نسبت ثابت ہے کہ انھوں نے اس حدیث کو سنا تھا مثلاً عبداللہ بن مسعود جو اس حدیث کے راوی ہیں وہ الفاظ کے پابند تھے۔ امام ابوحنیفہ کے زمانہ میں یہ حدیث عام ہو چکی تھی اس لئے ان کو اس کی تعمیل میں کیا عذر ہو سکتا تھا۔

فن اصول درایت

فن حدیث میں سب سے بڑا کام امام ابوحنیفہ نے یہ کہ درایت کے اصول قائم کئے اور ان کو احادیث کی تحقیق و تنقید میں برتا۔ فن حدیث کی ایک شاخ یعنی روایت پر ہمارے علماء نے جس قدر توجہ کی اس کی کوئی نظیر دنیا کی گذشتہ اور موجودہ تاریخ میں نہیں مل سکتی لیکن یہ افسوس ہے کہ اصول درایت کے ساتھ چنداں اعتنا نہیں کیا گیا۔ حافظ ابن حجر کی تحریر سے معلوم ہے کہ اس فن میں بعض تصنیفیں لکھی گئیں لیکن وہ اس قدر کم اور غیر متعارف ہیں کہ گویا نہیں ہیں۔ اصول حدیث ایک

---

[1] یعنی کہا گیا کہ روایت بالمعنی مطلقاً جائز نہیں۔ محدثین و فقہاء و اصولیین شافعیہ کا ایک گروہ اسی قول کا قائل ہے اور قرطبی نے کہا کہ امام مالک کا صحیح مذہب یہی ہے۔

فن بن گیا ہے اور بڑی بڑی کتابیں جو اس فن میں لکھی گئیں عموماً متداول ہیں لیکن اُن سے اصول و درایت کے متعلق بہت کم واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ حالانکہ یہی اصول فن حدیث کے نہایت ضروری اجزا ہیں - یہ عزت صرف امام ابو حنیفہ کو حاصل ہے کہ جب اس فن کا نام و نشان بھی نہ تھا اس وقت ان کی نگاہ باریک نکتوں پر پہنچی۔ بے شبہ صحابہ کی تاریخ میں جستہ جستہ اصولِ درایت کے آثار نظر آتے ہیں اور درحقیقت وہی امام ابو حنیفہ کے لئے دلیل راہ ہے - لیکن وہ باتیں عام مسائل کے ہجوم میں ایسی کم اور ناپید تھیں کہ اُن پر عام لوگوں کی نگاہیں نہیں پڑ سکتی تھیں -

روایت کی صحت و عدم صحت کا مدار ہمیشہ راویوں کے اعتبار پر نہیں ہوتا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک واقعہ کی روایت جس سند سے بیان کی جاتی ہے اس کے تمام راوی ثقہ اور قابل اعتبار ہوتے ہیں - لیکن واقعہ صحیح نہیں ہوتا - حدیث میں بھی اس کی سینکڑوں مثالیں ملتی ہیں اس لئے ضرور ہے کہ صرف رواۃ کی بنا پر احادیث کا فیصلہ نہ کیا جائے بلکہ یہ بھی دیکھا جائے کہ وہ اصولِ درایت کے مطابق ہے یا نہیں -

درایت سے یہ مطلب ہے کہ جب کوئی واقعہ بیان کیا جائے تو اس پر غور کیا جائے کہ وہ طبیعت انسانی کے اقتضاء، زمانہ کی خصوصیتیں، منسوب الیہ کے حالات اور دیگر قرائن عقلی کے ساتھ کیا نسبت رکھتا ہے - اگر اس معیار پر پورا نہیں اترتا تو اس کی صحت بھی مشتبہ ہو گی - یعنی احتمال ہو گا کہ روایت کے نے واقعہ کی صورت بدل دی ہے اس قسم کے قواعد حدیث کی تحقیق و تنقید میں بھی استعمال کئے جاتے اور انہیں کا نام اصول درایت ہے۔ علامہ ابن جوزی جو فن حدیث میں بڑا پایہ رکھتے تھے کہتے ہیں[1] کہ جس حدیث کو تم دیکھو کہ عقل کے مخالف یا اصول کے مناقض ہے تو یہ سمجھو کہ وہ

---

[1] ابن جوزی کے الفاظ جیسا کہ فتح المغیث میں منقول ہے یہ ہیں۔ "کل حدیث یخالف العقول او یناقض الاصول فاعلم انہ موضوع فلا یتکلف اعتبارہ ای لا تعتبر رواتہ ولا تنظر فی جرحہم او یکون مما یدفعہ الحس والمشاہدۃ او مباینا لنص الکتاب او السنۃ المتواترۃ والاجماع" (بقیہ ۱۲۵ پر دیکھئے)

موضوع ہے۔ اسی طرح وہ حدیث بھی موضوع ہے جو یا قرآن، حدیث، تواتر، اجماع قطعی کے مخالف یا اصول کے مناقض ہے تو یہ سمجھو کہ وہ موضوع ہے۔ اس میں راویوں کے تحقیق حال کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ اسی طرح وہ حدیث بھی موضوع ہے جو حس و مشاہدہ سے باطل ثابت ہو یا جس میں ایک معمولی سی بات پر سخت عذاب کی دھمکی ہو یا ذرا سے کام پر بڑے انعام کا وعدہ ہو۔ اس طرح کی حدیثیں واعظوں اور صوفیوں کی روایتوں میں بہت پائی جاتی ہیں۔

امام ابوحنیفہ رح نے درایت کے جو اصول مقرر کئے اُن میں سے بعض ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں: "جو حدیث عقل قطعی کے خلاف ہو وہ اعتبار کے قابل نہیں[1]" یہ وہی قاعدہ ہے جس کو ابن جوزی نے تمام اصول درایت پر مقدم رکھا ہے۔ ابن جوزی چھٹی صدی میں تھے۔ اس وقت اسلامی علوم اوج کمال تک پہنچ گئے تھے اور فلسفیانہ خیالات کا اثر زیادہ تر عام ہو گیا تھا۔ لیکن امام ابوحنیفہ کے زمانہ تک مذہب میں عقل کا نام لینا ایک جرم عظیم تھا۔ امام صاحب نے اول اول جب یہ قاعدہ قرار دیا اور روایات میں برتا تو سخت مخالفت ہوئی۔ اس قسم کی حدیثیں جن میں ناممکن اور محال واقعات بیان کئے جاتے ہیں امام صاحب کے سامنے پیش کی جاتی تھیں تو وہ ان سے انکار کرتے تھے یہ امر عام لوگوں پر گراں گزرتا تھا کیونکہ ان لوگوں کے خیال میں، جو بات کی تنقید کا مدار صرف رواۃ کی حالت پر تھا اصول درایت غرض نہ تھی زمانہ مابعد میں اگرچہ یہ قاعدہ اصول حدیث میں داخل کر لیا گیا لیکن ارباب روایت نے اس کو بہت کم برتا اور اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ آج بیسیوں مزخرفات اور دور از

(حاشیہ: جو حدیث عقل قطعی کے مخالف ہو وہ صحیح نہیں)

(بقیہ حاشیہ ۱۲۴) القطعی حیث لا یقبل شیٔ من ذلک التاویل او تتضمن الافراط بالوعید الشدید علی الامر الیسیر او بالوعد العظیم علی الفعل الیسیر وھذا الاخیر کثیر موجود فی حدیث القصاص والطرقیہ ۱۲

(فتح المغیث صفحہ ۹۸)

[1] اس اصول کو علامہ ابن خلدون نے مقدمہ تاریخ میں امام ابوحنیفہ کی طرف منسوب کیا ہے۔

کار حدیثیں قبول عوام کے شرف سے ممتاز ہیں۔

وَتِلْكَ الْغَرَانِيقُ الْعُلٰى کی حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلعم کی زبان سے (سورۂ نجم کی تلاوت کے وقت بتوں کی تعریف میں) یہ ادائے الفاظ ادا ہوئے تلک الغرانیق العلے۔ وان شفاعتهن لترتجی۔ (یعنی یہ بت بہت معزز ہیں اور ان کی شفاعت کی امید کی جاسکتی ہے" اور یہ الفاظ شیطان نے آنحضرت صلعم کی زبان میں ڈال دیے تھے۔ چنانچہ تلاوت کے بعد جبرئیل علیہ السلام آئے اور انھوں نے بیشک کی کہ میں نے تو یہ الفاظ آپ کو نہیں سکھائے تھے آپ نے کہاں سے پڑھ دیے۔ اس حدیث کو امام صاحب کے موافق بعض محدثین مثلاً قاضی عیاض و ابوبکر بیہقی وغیرہ نے غلط کہا۔ لیکن محدثین کا ایک بڑا گروہ اس کو اب بھی صحیح تسلیم کرتا ہے۔ متاخرین میں حافظ ابن حجر سے زیادہ نامور کوئی محدث نہیں گزرا اور بڑے زور شور سے اس حدیث کی تائید کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ چونکہ اس کے رواۃ ثقہ ہیں اس لئے اس کی صحت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح ردّ الشمس کی حدیث کو جس میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت علی رض کی نماز عصر قضا ہو گئی تھی اس لئے آنحضرت صلعم کی دعا سے آفتاب غروب ہونے کے بعد پھر طالع ہوا۔ محدث ابن جوزی نے جرأت کر کے موضوع کہا لیکن حافظ ابن حجر و جلال الدین سیوطی وغیرہ نہایت شدت سے مخالفت کی۔ امام صاحب کے وقت میں اس سے زیادہ مخالفتیں ہوئیں لیکن وہ ان باتوں کی کچھ پروا نہیں کرتے تھے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ لفظ عقل سے امام صاحب کی مراد وہ وسیع معنی نہیں ہیں جو آج کل کے تعلیم یافتہ لوگوں نے قرار دیے ہیں جس کی رو سے شریعت کے بہت سے اصلی مسائل برباد ہوئے جاتے ہیں

(۲) جو واقعات تمام لوگوں کو رات دن پیش آیا کرتے ہیں ان کے متعلق اگر رسول اللہ صلعم سے کوئی ایسی روایت منقول ہو جو اخبار احاد کے درجہ سے زیادہ نہ ہو تو وہ روایت مشتبہ ہو گی۔ یہ اصول اس بنا پر ہے کہ جو واقعات تمام لوگوں سے متعلق تھے اس لئے صرف ایک آدھ شخص تک اس روایت کا محدود رہنا درایت کے

کے خلاف ہے۔

اکثر مصنفین نے تصریح کی ہے کہ امام ابوحنیفہ رح اس روایت کو قبول نہیں کرتے جو قیاس کے مخالف ہو اگرچہ یہ قول محض بے اصل نہیں ہے لیکن اس کی تعبیر میں لوگوں نے اکثر غلطی کی ہے اور انھیں غلط تعبیرات کا اثر ہے کہ امام ابوحنیفہ کی نسبت ارباب ظاہر میں بہت سی بدگمانیاں قائم ہو گئیں۔ ان لوگوں نے امام صاحب کے مقصد و منشاء پر کافی غور نہیں کی اور عام رائے قائم کر لی کہ وہ قیاس کو حدیث پر مقدم سمجھتے ہیں۔ امام صاحب سے اس مسئلہ کے متعلق جو اقوال منقول ہیں وہ صریح اس دعویٰ کے خلاف ہیں۔ مسائل فقہ میں متعدد مثالیں موجود ہیں جن میں ابوحنیفہ نے حدیث واثر کی وجہ سے قیاس کو مطلقاً ترک کر دیا ہے۔ امام محمد اس بحث میں کہ قہقہہ نماز ناقص وضو ہے امام ابوحنیفہ کی طرف استدلال کرتے ہیں اور لکھتے ہیں: لولا ماجاء من الآثار کان القیاس علے ما قال اھل المدینۃ ولکن لا قیاس مع اثر ینبغی الا ان ینقاد الآثار۔ یعنی قیاس وہی ہے جو اہل مدینہ کہتے ہیں لیکن حدیث کے ہوتے قیاس کوئی چیز نہیں اور صرف حدیث ہی کی پیروی کرنی چاہیئے" اس سے زیادہ اس باب میں کیا تصریح ہو سکتی ہے۔ عقود الجمان کے مصنف نے مختلف روایتوں سے امام ابوحنیفہ کے خاص اقوال نقل کئے ہیں کہ میں حدیث کے مقابلہ میں قیاس کو دخل نہیں دیتا۔ امام جعفر صادق رض سے امام صاحب نے جو گفتگو کی تھی اس میں بھی اس خیال کا اظہار کیا ہے۔

مخالفت قیاس

ان تصریحات کو دیکھ کر بعضوں نے اس انتساب میں تخصیص کی اور دعویٰ کیا کہ "جو حدیث قیاس جلی کے مخالف ہو اس کو امام صاحب قبول نہیں کرتے" عبدالکریم شہرستانی نے اصحاب الرائے کے بیان میں جہاں امام ابوحنیفہ اور ان کے تلامذہ کا ذکر آیا ہے لکھا ہے کہ وربما یقدمون القیاس الجلی علے احاد الاخبار (یعنی یہ لوگ اکثر قیاس جلی کو اخبار احاد پر ترجیح دیتے ہیں۔ امام رازی نے بھی مناقب الشافعی میں اس کی جابجا تصریح کی ہے۔ اس کی بنا پر امام ابوحنیفہ کے مقابلہ میں امام

شافعی کی ترجیح کے وجوہ قائم کئے ہیں۔

میں نے بہت جدّ و جہد کی کہ اس مسئلہ کے متعلق امام صاحب کا کوئی صریح قول مل سکے لیکن نہ مل سکا۔ جن لوگوں نے امام صاحب کی طرف اس قول کو منسوب کیا ہے غالباً صرف استنباط سے کام لیا ہے۔ صریح قول نہیں پیش کر سکتے۔ بے شبہ حنفیوں کے اصول فقہ میں یہ مسئلہ مذکور ہے کہ "وہ حدیث جس کے رواۃ فقیہ نہ ہوں اور ہر طرح قیاس کے مخالف ہو قابل حجت نہیں" لیکن یہ حنفیوں کا مسلمہ اصول نہیں ہے بلکہ صرف عیسٰے ابن ابان اور ان کے پیروؤں کی رائے ہے۔ ابوالحسن کرخی وغیرہ صریح اس کے مخالف ہیں اور صاحب مسلم الثبوت نے اس قول کو ترجیح دی۔ تعجب اور سخت تعجب ہے کہ بغیر کسی ثبوت کے امام ابوحنیفہ کی طرف یہ دعویٰ صرف اس اعتماد پر منسوب کر دیا گیا کہ فقہائے حنفیہ میں سے چند علماء اس کے قائل ہیں۔ بہت بڑی مثال بیع مصرّاۃ کی پیش کی جاتی ہے جس سے یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہ نے اس مسئلہ میں صریح حدیث کے ہوتے ہوئے قیاس کو مقدم رکھا ہے۔ لیکن ان مدعیوں کو معلوم نہیں کہ اس مثال میں قیاس کی تقدیم بعض علمائے حنفیہ کی ذاتی رائے ہے۔ امام صاحب سے اس کو کچھ واسطہ نہیں امام رازی نے مناقب الشافعی میں اتنی احتیاط کی کہ اس موقع پر امام ابوحنیفہ کا نام نہیں لیا بلکہ اصحاب ابی حنیفہ لکھا۔ لیکن ہم اس احتیاط میں بھی ان کو معذور نہیں رکھتے۔ کیونکہ یہ رائے بعض حنفیوں کی ہے نہ سب کی۔ امام رازی نے اصحاب کے لفظ سے جو تعمیم ظاہری کی وہ صحیح نہیں ہے[1]

بیع مصراۃ کی حدیث کو امام ابوحنیفہ نے قیاس کی بناء پر رد نہیں کیا بلکہ اس کے نسخ کا دعویٰ کیا ہے۔ امام طحاوی نے معانی الآثار میں اس بحث کو نہایت تفصیل سے لکھا ہے۔ امام ابوحنیفہ و امام محمد کا مذہب لکھ کر لکھتے ہیں ا۔

وذھبوا الی ان ما روی عن رسول اللہ صلعم فی ذلک مما تقدم ذکرنا لہ فی

[1] تعجب ہے کہ بڑے بڑے علماء یہاں تک کہ امام غزالی امام رازی نے بھی امام ابوحنیفہ رح کی نسبت یہ الزام لگایا اور یہی بیع مصراۃ کی مثال پیش کی ۱۲

ھذا الباب منسوخ (یہ لوگ اس بات کے قائل ہوئے کہ اس بارہ میں جو کچھ رسول اللہ صلعم سے روایت کیا گیا ہے وہ منسوخ ہے۔)

اس موقع پر ہم اس بحث کی تفصیل نہیں کر سکتے، صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس مسئلہ میں امام صاحب نے قیاس کو ترجیح نہیں دی بلکہ نسخ کا دعویٰ کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے موقعوں پر نہایت دقیقہ بینی سے دیکھنا چاہیئے کہ جو اقوال امام صاحب کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں وہ ان سے ثابت بھی ہیں یا نہیں؟ متاخرین نے ان باتوں میں کم احتیاط کی ہے۔ اس لئے ہم کو نہایت غور و تحقیق سے کام لینا چاہئے یہی بیع مصراۃ کی حدیث ہمیشہ اصول موضوعہ کے طور پر پیش کی جاتی ہے اور اس سے ثابت کیا جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہ قیاس کو حدیث پر مقدم رکھتے تھے لیکن ذرا تحقیق سے کام لو تو معلوم ہوتا ہے کہ اس تمام شور و غل کی کچھ اصل نہیں بخلاف اس کے نہایت قوی ذریعہ سے امام ابوحنیفہ کی تصریحات ثابت ہیں کہ وہ حدیث کے مقابلہ میں قیاس کا مطلق اعتبار نہیں کرتے تھے امام محمد اس بحث کے ذیل میں کہ جو شخص بھول کر کچھ کھا پی لے تو روزہ نہیں ٹوٹتا اور قضا نہیں لازم آتی حدیث پر استدلال کر کے لکھتے ہیں کہ آثار کے ہوتے ہوئے رائے کچھ چیز نہیں۔ پھر امام ابوحنیفہ کا خاص قول نقل کرتے ہیں کہ لولا ماجاء فی ھذا من الآثار لامرت بالقضاء۔ یعنی اگر اس بارہ میں آثار موجود نہ ہوتے تو میں قضا کا حکم دیتا[1]

ہاں یہ ضرور ہے کہ احادیث کے ثبوت کے متعلق امام ابوحنیفہ نہایت سخت تھے جب تک وہ شرطیں پائیں نہ جائیں وہ حدیث کو قابل استدلال نہیں سمجھتے۔ لیکن ان شرطوں کے ساتھ حدیث ثابت ہو تو ان کے نزدیک قیاس کوئی چیز نہیں ہے۔

جس حد تک ہم تحقیق کر سکے امام ابوحنیفہ نے قیاس فقہی کو حدیث پر کبھی ترجیح نہیں رکھا لیکن ان کے زمانہ تک قیاس کا لفظ نہایت وسیع معنوں میں مستعمل تھا اور ان کے معنوں کے لحاظ سے امام صاحب نے قیاس کو حدیث میں دخل

[1] کتاب الحجج امام محمدؒ ۱۲

دیا ہے۔ اور احکام شرعیہ کے متعلق اسلام میں شروع ہی سے دو فرقے قائم ہو گئے تھے۔ ایک کا خیال تھا کہ شرعی احکام کسی مصلحت اور اقتضائے عقل پر مبنی نہیں ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ حسن و قبح اشیائے عقلی نہیں ہیں۔ دوسرے فریق کی رائے تھی کہ تمام احکام مصالح پر مبنی ہیں جن میں سے بعض مصلحتیں صاف نمایاں ہیں اور خود شارع کے کلام سے اس کے اشارے پائے جاتے ہیں۔ بعض ایسے ہیں جن کی مصلحت ہم کو معلوم نہیں لیکن فی الواقع وہ مصالحت سے خالی نہیں اس اختلاف رائے نے حدیثوں کی روایت پر مختلف اثر پیدا کئے بعض لوگ جب کسی حدیث کو سنتے تھے تو صرف یہ دیکھ لیتے تھے کہ اس کے راوی ثقہ ہیں یا نہیں؟ اگر ان کے خیال میں قابل حجت ہیں تو پھر ان کو کوئی بحث نہیں ہوتی تھی اور بے تکلف اس حدیث کو قبول کرتے تھے۔ دوسرا فریق حسن و قبح عقلی کا قائل تھا یہ بھی دیکھتا تھا کہ جو مسئلہ اور عقیدہ حدیث سے مستنبط ہوتا ہے وہ عقل و مصلحت کے موافق ہے یا نہیں؟ اگر نہیں ہوتا تو وہ حدیث کی زیادہ تحقیق و تنقید کی طرف مائل ہوتے تھے وہ دیکھتے تھے کہ راوی فہم و درایت کے لحاظ سے کیا پایہ رکھتے ہیں۔ روایت باللفظ ہے یا بالمعنی۔ موقع حدیث کیا تھا، کون لوگ مخاطب تھے کیا حالت تھی۔ غرض اس قسم کے اسباب اور وجوہ پر غور کرتے تھے۔ ان باتوں سے اکثر اصل حقیقت کا پتہ لگ جاتا تھا۔

یہ طرز تحقیق صحابہ کے زمانہ میں قائم ہو چکا تھا۔ صحیح ابن ماجہ و ترمذی میں ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے رسول اللہؐ سے حدیث روایت کی کہ توضؤا مما غیرالنار یعنی جس چیز کو آگ نے متغیر کر دیا ہو اس کے استعمال سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ اسی بنا پر بعض مجتہدین قائل ہیں کہ گوشت کھانے سے وضو لازم آتا ہے۔ ابوہریرہؓ نے جب یہ حدیث بیان کی تو عبداللہ بن عباسؓ موجود تھے بولے کہ انتوضاء من الحمیم یعنی اس بنا پر تو گرم پانی کے استعمال سے بھی وضو لازم آتا ہے“ ابوہریرہؓ نے کہا اے برادر زادہ! جب رسول اللہؐ سے کوئی حدیث سنو تو اس پر مثالیں نہ کہو۔ لیکن عبداللہ بن عباس اپنی رائے پر قائم رہے۔ حضرت عائشہؓ نے ابن عمرؓ کی اس حدیث پر ان المیت لیعذب

ہبکا ء ۱ ھللہ جو اعتراض کیا تھا اسی طرزِ تحقیق پر مبنی تھا صحابہ کے حالات میں اس قسم کی متعدد مثالیں ملتی ہیں جن کا استقصار اس موقعہ پر ضروری نہیں۔

امام ابوحنیفہؒ کا بھی یہی مسلک تھا اور اسی کو لوگوں نے قیاس کے لفظ سے شہرت دی۔ اس مسئلہ پر کہ احکام شریعت مصالح پر مبنی ہیں اس موقعہ پر ہم تفصیلی گفتگو نہیں کرسکتے شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی بے نظیر کتاب حجۃ اللہ البالغہ اس بحث کے لئے کافی ووافی ہے۔ یہاں اس قدر کہنا ضروری ہے کہ علماء اسلام میں جو لوگ عقل و نقل دونوں کے جامع تھے مثلاً امام غزالی، عزالدین، عبدالسلام، شاہ ولی اللہ وغیرہ ان لوگوں کا یہی مسلک تھا۔

امام ابوحنیفہؒ احادیث کی تنقید میں اس اصول کو ضروری طور پر ملحوظ رکھتے تھے۔ دو متعارض حدیثیں جو روایت کی حیثیت سے یکساں نسبت رکھتی تھیں ان میں وہ اس حدیث کو ترجیح دیتے تھے جو اصول مذکور کے موافق ہو۔

امام صاحب نے بعض موقعوں پر محض اس اصول کی مخالفت کی وجہ سے بعض حدیثوں کے تسلیم میں تامل کیا ہے ان کی اصطلاح میں یہ ایک علتِ خفیہ ہے۔ محدثین نے اقسام حدیث میں ایک قسم معلل قرار دی ہے جس کی یہ تعریف ہے کہ حدیث میں بظاہر صحت کی تمام شرطیں پائی جاتی ہیں اور وہ قابل استدلال نہیں ہوتی۔ اس قسم کی حدیثوں کی تمیز پر محدثین کو نہایت فخر ہے اور وہ اس کو ایک قسم کا الہام سمجھتے ہیں۔ علی بن المدینی جو امام بخاری کے استاد اور بہت بڑے محدث تھے ان کا قول ہے کہ هي الهام ولو سالت القيم العدل من اين لك هذا لم تكن له حجة ۔ یعنی یہ الہام ہے اور اگر تم ماہر عدل سے پوچھو کہ تم نے کیونکر اس کو معلل کہا تو وہ کوئی دلیل نہیں پیش کرسکتا۔[1] محدث ابوحاتم سے ایک شخص نے چند حدیثیں پوچھیں انھوں نے بعض کو مدرج بعض کو باطل بعض کو منکر بعض کو صحیح بتایا۔ پوچھنے والے نے کہا کہ آپ کو کیونکر معلوم ہوا۔ کیا راوی نے آپ کو ان باتوں کی اطلاع دی؟ ابوحاتم نے کہا نہیں۔ بلکہ مجھ کو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ سائل نے کہا تو کیا آپ علم غیب کے مدعی ہیں؟ ابوحاتم نے جواب دیا کہ تم اور ماہرین فن سے پوچھو۔ اگر وہ میرے ہم زبان ہوں تو سمجھنا کہ میں نے بیجا نہیں

---

[1] فتح المغیث صفحہ ۹۸

کہا۔ سائل نے ابوزرعہ سے وہ حدیثیں جا کر دریافت کیں؟ انھوں نے ابوحاتم کی موافقت کی تب سائل کو تسکین ہوئی۱؎۔

بعض محدثین کا قول ہے اثریہجم علے قلوبھم لا یمکنھم ردہ وھیئتہ نفسانیۃ لامعدل لھم (یعنی وہ ایک امر ہے جو ائمہ حدیث کے دل پر وارد ہوتا ہے اور وہ اس کو رد نہیں کر سکتے اور نفسانی اثر ہے جس سے گریز نہیں ہو سکتا) محدثین کا یہ دعویٰ بالکل صحیح ہے۔ بلاشبہ فن روایت کی ممارست سے ایک ملکہ یا مذاق پیدا ہو جاتا ہے جس سے خود تمیز ہو جاتی ہے کہ یہ قول رسول اللہ صلعم کا ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اسی طرح شریعت کے احکام و مسائل اور ان کے اسرار و مصالح کے تتبع اور استقرا سے ایسا ذوق حاصل ہو سکتا ہے جس سے یہ تمیز ہو سکتی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے یہ حکم دیا ہوگا یا نہیں۔ لیکن اسرار و مصالح کا تتبع محدث کا فرض نہیں ہے وہ مجتہد کے ساتھ مخصوص ہے اور یہی وجہ ہے کہ جب ان دقیق وجوہ کے لحاظ سے امام ابوحنیفہ نے بعض حدیثوں کو معلل قرار دیا تھا ارباب ظاہر نے مخالفت کی اور بعضوں کو بدگمانی ہوئی کہ امام حدیث کو عقل و درائے کی بنا پر رد کر تے ہیں۔ لیکن انصاف پسند انصاف کر سکتا کہ جب روایات اور بظاہر الفاظ کے استقرار سے محدثین کو ایسا مذاق پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ ایک حدیث کو جس میں بظاہر صحت کی تمام شرطیں پائی جاتی ہیں رد کر سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ جس شخص نے دقت نظر اور نکتہ شناسی کے ساتھ احکام شریعت کے مصالح و اسرار کا تتبع کیا ہو وہ ایسے وجدان اور ذوق سے محروم رہے۔ البتہ یہ نہایت نازک اور ذمہ داری کا کام ہے جس کا صرف وہ شخص متکفل ہو سکتا ہے جو بہت بڑا عالم مجتہد محدث دقیقہ رس مؤید بتائید الٰہی ہو۔ لیکن ان شرطوں کا جامع امام ابوحنیفہ سے زائد کون ہو سکتا ہے۔

مراتب احادیث کا تفاوت

نہایت مہتم بالشان اور دقیق چیز امام ابوحنیفہ نے اس فن میں اضافہ کی وہ احادیث کے مراتب کا تفاوت اور ان تفاوتوں کے لحاظ سے احکام شرعیہ کی تقسیم ہے۔ احکام او رمسائل کا پہلا ماخذ قرآن ہے جس میں کسی کو گفتگو نہیں ہو سکتی۔ قرآن کے

۱؎ فتح المغیث صفحہ ۹۵

بعد حدیث کا تبہ ہے۔ حدیث اور قرآن میں اصل امر لحاظ سے تو چنداں فرق نہیں۔ وہ وحی متلو ہے اور یہ غیر متلو۔ جو کچھ تفاوت اور اختلاف ہے وہ ثبوت کی حیثیت سے۔ اگر کوئی حدیث اسی تواتر اور قطعیت سے ثابت ہو جس طرح قرآن ثابت ہے تو اثبات احکام میں وہ قرآن کے ہم پلہ ہے۔ لیکن حدیثوں کے ثبوت کے مراتب متفاوت ہیں اور احکام کے ثبوت میں انھیں تفاوتوں کے لحاظ کی ضرورت ہے۔ محدثین نے حدیث کی جو قسمیں کی ہیں۔ صحیح، حسن، ضعیف، مشہور، عزیز، غریب وغیرہ ان کے اختلاف مراتب سے احکام پر چنداں اثر نہیں پڑتا۔ چنانچہ ان قسموں سے محدثین صرف ضعیف کا اعتبار نہیں کرتے باقی اقسام کو قریباً یکساں قابل حجت قرار دیتے ہیں۔ محدثین کو اس سے زیادہ تدقیق اور امتیاز مراتب کی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ استنباط احکام اور تفریع مسائل ان کا فرض تھا۔ لیکن امام ابوحنیفہ کی تدوین فقہ کی وجہ سے جسکے وہ بانی اوّل ہیں زیادہ تدقیق اور فرق مراتب کی ضرورت پڑی۔ انھوں نے نوعیت ثبوت کے لحاظ سے حدیث کی تین قسمیں قرار دیں (١) متواتر یعنی وہ حدیث جس کے رواۃ پہلے طبقہ روایت میں اس کثرت سے ہوں جن کے تواتر علی الکذب کا گمان نہیں ہو سکتا یعنی رسول اللہ ص سے بیشمار لوگوں نے روایت کی ہو۔ اسی طرح ان لوگوں سے لیکر اخیر زمانہ تک بیشمار رواۃ چلے آتے ہوں

متواتر

(٢) مشہور یعنی وہ حدیث جسکے رواۃ پہلے طبقہ روایت میں تو بہت نہ ہوں لیکن دوسرے طبقہ سے اخیر تک اس کی کثرت ہوں جو متواتر کے لئے مشروط ہے (٣) احاد جو متواتر او مشہور نہ ہو۔ اس قسم کا اثر ان کی رائے کے موافق احکام شرعیہ پر جو پڑتا ہے وہ یہ ہے کہ متواتر سے فرضیت اور کیفیت ثابت ہو سکتی ہے۔ مشہور کا درجہ چونکہ متواتر سے کم ہے اس لئے فرضیت کا اثبات تو نہیں ہو سکتا لیکن قرآن میں جو حکم مطلق ہو حدیث مشہور سے مقید ہو سکتا ہے۔ اسی طرح اس سے زیادہ علی الکتاب ہو سکتی ہے۔ احاد کا ثبوت چونکہ بالکل ظنی ہے اس لئے وہ قرآن کے احکام منصوصہ پر کچھ اثر نہیں پیدا کر سکتی۔ یہ مسئلہ اگرچہ نہایت واضح اور صاف ہے لیکن تعجب ہے کہ امام شافعی اور بعض محدثین اس کے مخالف ہیں۔ امام بیہقی وغیرہ نے بعض مناظرات نقل کئے ہیں جو امام شافعی رح اور امام

مشہور

احاد

محمدؒ میں واقع ہوئے اور جن میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس مسئلہ میں امام شافعی نے امام محمدؒ کو بند کر دیا اگرچہ ہمارے نزدیک یہ مناظرے یہ فرضی مناظرے ہیں جن کا ثبوت اصول روایت سے مطابق ہرگز نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس قدر ضرور ثابت ہوتا ہے کہ اس مسئلہ کا انتساب امام ابو حنیفہ کی طرف ضرور صحیح ہے۔

قوی سے قوی جو اعتراض اس مسئلہ پر کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ خود امام ابو حنیفہ رح اور ان کے تلامذہ اس کے پابند نہ رہ سکے۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں لکھا ہے کہ امام شافعیؒ نے امام محمدؒ سے کہا کہ کیا آپ کے نزدیک خبر واحد سے قرآن پر زیادتی نہیں ہو سکتی؟ امام محمدؒ نے کہا ہاں۔ امام شافعی نے کہا کہ قرآن مجید میں والدین کے حق میں وصیت کا حکم ہے آپ اس حدیث کی بنا پر لا وصیۃ للوارث وصیت کو کو ناجائز کیوں قرار دیتے ہیں؟ غالباً شاہ صاحب نے یہ روایت بیہقی کی کتاب الشافعی سے لی ہے جس میں اور بھی بے سرو پا روایتیں مذکور ہیں۔ لیکن ہم شاہ صاحب کی خدمت میں عرض کرتے ہیں کہ حنفیوں کے نزدیک وارثوں کے حق میں وراثت کا حکم کسی حدیث سے نہیں منسوخ ہوا۔ بلکہ خود قرآن مجید کی اس آیت سے جس میں توریث کے احکام ہیں یہ صرف حنفیوں ہی کی رائے نہیں بلکہ تمام مفسرین کا یہی قول ہے (الا الشاذ النادر و منہم)۔

ان مسائل پر اور بھی بہت سی بحثیں پیدا ہو گئی ہیں جن کی تفصیل ہم نہیں کر سکتے لیکن اخبار احاد کی بحث اور اس سے جو عقائد اسلام پر اثر پڑتا ہے اس کو ہم اس موقع پر تفصیل سے لکھتے ہیں۔ کیونکہ بعض محدثین کو زیادہ تر اسی مسئلہ میں ان سے اختلاف ہے۔

اخبار احاد کی نسبت اگرچہ محققین اور اکثر ائمہ حدیث کا یہی مذہب ہے کہ وہ ظنی الثبوت ہیں لیکن ایک فرقہ اس کے خلاف بھی ہے جس کے سرگروہ علامہ ابن الصلاح ہیں۔ اگرچہ علامہ ابن الصلاح نے بھی اخبار احاد کی تمام حدیثوں کو قطعی نہیں تسلیم کیا ہے۔ انھوں نے صحیح حدیث کی سات قسمیں کی ہیں (۱) جس پر بخاری و مسلم دونوں متفق ہوں (۲) بخاری منفرد ہو (۳) مسلم منفرد ہو (۴) بخاری و مسلم نے اس کو روایت نہ کیا ہو لیکن

ان کی شرطوں کے موافق ہو (۵) صرف بخاری کی شرط پر ہو (۶) صرف مسلم کی شرط پر ہو (۷) بخاری و مسلم کی شرط کے موافق نہ ہو لیکن اور محدثین نے اس کو صحیح تسلیم کیا ہو۔ ان سات قسموں میں سے علامہ ابن الصلاح پہلی کو قطعی الصحۃ قرار دیتے ہیں اور لکھتے ہیں وهذا القسم جميعه مقطوع بصحته والعلم النظرى واقع به۔ منفردات بخاری و مسلم کی نسبت اُن کی رائے ہے کہ اسی قبیل میں داخل ہیں بجز ان چند حدیثوں کے جن پر دارقطنی وغیرہ نے جرح کی ہے۔ ابن الصلاح کا قول اگرچہ ظاہر بینوں میں اور بالخصوص آجکل زیادہ رواج پا گیا لیکن کچھ شبہہ نہیں وہ بالکل غلط اور بے دلیل خیال ہے اور خود ائمہ حدیث اس کے مخالف ہیں ۔ علامہ نووی شرح مسلم میں ابن الصلاح کا قول تفصیلاً نقل کر کے لکھتے ہیں وهذا الذى ذكره الشيخ فى هذه المواضع خلاف ما قاله المحققون والاكثرون فانهم قالوا احاديث الصحيحين التى ليست بمتواترة انما تفيد الظن على تقررها لا فرق بين البخارى والمسلم وغيرهما فى ذلك یعنی شیخ ابن الصلاح نے ان موقعوں پر جو کچھ کہا وہ محققین اور اکثروں کی رائے کے خلاف ہے ۔ کیونکہ محققین اور اکثروں کا قول ہے کہ صحیحین کی حدیثیں جو تواتر کے رتبہ کو نہیں پہنچی ہیں صرف ظن کی مفید ہیں کیونکہ وہ اخبار احاد ہیں اور اخبار احاد کی نسبت ثابت ہو چکا ہے کہ ان سے صرف ظن پیدا ہو سکتا ہے اور اس باب میں بخاری و مسلم اور اور لوگ سب برابر ہیں ابن الصلاح کے قول کو اور ائمہ فن نے بھی رد کیا ہے ۔ لیکن ہم اس بحث کو لفظی طور سے طے کرنا نہیں چاہتے ۔ ہم کو خود غور کرنا چاہیئے کہ اخبار احاد سے یقین پیدا ہو سکتا ہے یا ظن۔

کسی حدیث کو جب ایک محدث گو وہ کسی رتبہ کا ہو صحیح کہتا ہے تو اس کا یہ دعویٰ درحقیقت چند ضمنی دعووں پر مشتمل ہوتا ہے یعنی یہ کہ روایت متصل ہے اس کے رواۃ ثقہ ہیں، ضابطۃ القلب ہیں، روایت میں شذوذ نہیں ہے، کوئی علت قادحہ نہیں ہے، یہ سب امور ظنی اور اجتہادی ہیں جن پر یقین کی بنیاد قائم ہو سکتی ہے جس طرح ایک فقیہ کسی مسئلہ کو قرآن یا حدیث سے استنباط کر کے اپنی دانست

میں صحیح سمجھتا ہے اور اس کی صحت یقینی نہیں ہوتی کیونکہ استنباط میں جن مقامات سے کام لیا ہے اکثر اس کے ظنیات اور اجتہادات پر مبنی ہے ایک یا چند محدثین نے کسی حدیث کو اگر صحیح کہا ہے اور دوسرا شخص اس کی صحت تسلیم نہیں کرتا تو وہ صرف اس گناہ کا مجرم ہے کہ اس محدث یا محدثین کے اصول تحقیق، قواعد استنباط، طریق روایت، غرض ان کے اجتہادات اور مزعومات کا مخالف ہے حدیث کی تنقید کے لئے محدثین کے لئے جو اصول مقرر کئے ہیں اور جن پر احادیث کی صحت کا مدار ہے سب عقلی اور اجتہادی مسائل ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان میں خود محدثین باہم اختلاف عظیم رکھتے ہیں۔ ظاہر بینوں کا خیال ہے کہ حدیث کا فن نقلی ہے نہ عقلی۔ لیکن جس شخص نے اصول حدیث پر غور کی وہ اس خیال کی غلطی کو نہایت آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ اسی نکتہ کی طرف امام ابوحنیفہ نے اشارہ کیا ہے کہ ھذا الذی نحن فیہ رای لا نجبر علیہ احدًا ولا نقول یجب علے احد قبولہ۔ بعضوں نے غلطی سے امام صاحب کے اس وسیع قول کو فقہ پر محدود سمجھا۔ لیکن ان کو معلوم نہیں کہ مجتہد کو مسائل سے زیادہ مسائل کے اخذ سے بحث ہوتی ہے۔

اصول حدیث کے ظنی اور اجتہادی ہونے ہی کا اثر ہے کہ محدثین کو احادیث کی صحت و عدم صحت میں اختلاف ہوتا ہے۔ ایک محدث ایک حدیث کو نہایت صحیح مستند واجب العمل قرار دیتا ہے دوسرا اس کو ضعیف بلکہ موضوع کہتا ہے محدث ابن جوزی نے بہت سی حدیثوں کو موضوعات میں داخل کیا ہے جن کو دوسرے محدثین صحیح اور حسن کہتے ہیں۔ ابن جوزی نے تو یہ قیامت کی کہ صحیحین کی بعض حدیثوں کو موضوع لکھدیا۔ علامہ سخاوی لکھتے ہیں بل ربما ادرج فیھا الحسن والصحیح مما فی احدی الصحیحان فضلاً عن غیرھما (یعنی ابن جوزی نے حسن اور صحیح تک کو جو بخاری یا مسلم تک میں موجود ہیں موضوعات میں درج کر دیا ہے دوسری کتابوں کا کیا ذکر ہے) بے شبہہ ابن جوزی نے اس افراط میں غلطی کی لیکن یہ غلطی ایک اجتہادی غلطی ہے جس کا حاصل اسی قدر ہے کہ انھوں نے بخاری یا مسلم

کے صحیح اجتہاد کو غلط خیال کیا۔ ان اصولی اختلافات کی وجہ سے احادیث کی صحت اور عدم صحت میں جو اختلاف پیدا ہو گئے ہیں ان کا استقصار کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے۔

حدیث مرفوع کی پہلی ضروری شرط یہ ہے کہ رسول اللہ صلعم تک متصل ثابت ہو لیکن اتصال کے ثبوت کے جو طریقے تسلیم کئے ہیں ان میں اکثر ظنی اور اجتہادی ہیں صحابہ کے ان الفاظ کو " یہ امر سنت ہے " " ہم کو یہ حکم دیا گیا تھا " " ہم اس بات سے روکے گئے تھے " " رسول اللہؐ کے زمانہ میں ہم فلاں کام کرتے تھے یا ہم اس کو برا نہیں سمجھتے تھے " اکثروں نے مرفوع قرار دیا ہے۔ اور بعضوں نے یہاں تک وسعت دی کہ جن حدیثوں میں یہ الفاظ تھے ان کو لفظوں سے روایت کر دیا کہ رسول اللہؐ نے فرمایا۔ حالانکہ یہ الفاظ اس معنیٰ میں قطعی الدلالۃ نہیں ہیں بلکہ صحابہ کے ظن اور اجتہاد پر مبنی ہیں جس کی نسبت عموماً تسلیم کیا گیا ہے فہم الصحابی لیس بحجۃ (یعنی صحابی کی سمجھ کوئی دلیل نہیں) اسی بنا پر بعض علماء نے اختلاف کیا اور کہا یہ الفاظ رفع و اتصال کے لئے کافی نہیں ہیں۔ امام شافعی، ابن حزم ظاہری ابوبکر رازی اور دیگر محققین صحابہ کے اس قول کو کہ " یہ فعل سنت ہے " حدیث مرفوع نہیں قرار دیا۔ کتب سیر و احادیث میں بیسیوں مثالیں ملتی ہیں جن میں صحابی نے یہ الفاظ استعمال کئے اور وہ حدیث نبویؐ نہ تھی بلکہ خود ان کا قیاس و اجتہاد تھا۔ لیکن اکثر محدثین نے ان حدیثوں کو مرفوع کہا۔ اس خیال نے یہ آفت پیدا کی کہ اس کی بنا پر بعض رواۃ نے صریح مرفوع الفاظ میں حدیث کی روایت کر دی جس کی وجہ سے ایک عام شبہ پیدا ہو گیا۔

معنعن روایتوں میں اتصال کا ثابت ہونا نہایت مشکل ہے حالانکہ اس قسم کی روایتیں کثرت سے ہیں۔ امام بخاری کا مذہب ہے معنعن حدیثوں میں اگر یہ ثابت ہو راوی اور مروی عنہ دونوں ہمزمان اور کبھی ملے بھی تھے تو وہ حدیث متصل سمجھی جائے گی۔ امام مسلم حالانکہ امام بخاری کے شاگرد اور زیادہ تر انھیں

کے طریقے کے پیرو تھے تاہم انھوں نے نہایت سختی سے اس شرط کی مخالفت کی اور صرف ہمزبان ہونا کافی سمجھا۔ اس اختلاف کا یہ نتیجہ ہے کہ امام بخاری کے اصول کے موافق امام مسلم کی تمام معنعن جن میں لقاء ثابت نہیں ہے مقطوع ہیں حالانکہ امام مسلم ان کو متصل سمجھتے ہیں اور اس پر ان کو یہاں تک اصرار ہے کہ اپنے مخالف کو سخت الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔ امام مسلم نے تو زیادہ توسیع کی لیکن امام بخاری کی شرط کے موافق بھی معنعن روایت میں اتصال کا ثبوت محض ظنی ہے۔ یہ کچھ ضروری نہیں کہ دو شخص ہمزبان اور ہم لقاء ہوں تو ان کی روایتیں ہمیشہ بالذات ہوں۔ جہاں حدثنا اور اخبرنا ہوگا وہاں ایسا ہونا البتہ ضرور ہے لیکن اگر یہ الفاظ نہیں ہیں اور راوی نے عن کے لفظ سے روایت کی ہے تو اتصال کا خیال قیاس غالب ہوگا لیکن یقینی نہ ہوگا۔ حدیث و سیر میں بیسیوں مثالیں مل سکتی ہیں کہ دو راوی ایک زمانہ میں موجود تھے اور آپس میں ملاقات بھی تھی تاہم ایک نے دوسرے سے بعض روایتیں بواسطہ کیں۔ روزمرہ کے تجربوں میں اس کی سینکڑوں شہادتیں ملتی ہیں۔

رجال کی تنقید

سب سے بڑا ضروری اور اہم مسئلہ رجال کی تنقید ہے۔ اخبار احاد کا تمام تر مدار رجال پر ہے لیکن رجال کی تنقید و توثیق ایسا ظنی مسئلہ ہے جس کا قطعی فیصلہ نہایت مشکل اور قلیل الوجود ہے۔ ایک شخص کو دوسرے اشخاص ضعیف الروایۃ غیر ثقہ ناقابل اعتبار خیال کرتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ دونوں فریق اس رتبہ کے ہوتے ہیں جن کی عظمت و شان سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ امام بخاری و مسلم میں گو ایسا اختلاف نہیں تاہم بہت سے رواۃ ہیں جن کو ان دونوں اماموں سے ایک قابل حجت سمجھتا ہے اور دوسرا نہیں سمجھتا۔ علامہ نووی نے مقدمہ صحیح مسلم میں بعضوں کے نام بھی لکھے ہیں اور محدث حاکم کی کتاب المدخل سے نقل کیا ہے کہ ان لوگوں کی تعداد جن سے امام مسلم نے مسند صحیح میں احتجاج کیا ہے اور امام بخاری جامع صحیح میں ان سے حجت نہیں لی ۲۲۵ ہے۔

میزان الاعتدال کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سینکڑوں بلکہ ہزاروں
رواۃ ہیں جن کی جرح و تعدیل مختلف فیہ ہے اور ایسا ہونا ضرور تھا۔ کسی شخص کے
ان تمام اوصاف و عادات پر مطلع ہونا جن کا اثر روایت کی قوت و ضعف پر پڑ سکتا
ہے۔ مدتوں کی ملاقات اور تجربہ پر موقوف ہے۔ جرح و تعدیل کے کام میں مصروف
تھے سینکڑوں ہزاروں راویوں سے ایسی عمیق واقفیت کیونکر حاصل کر سکتے تھے۔
اسی لئے مختلف قرائن ظاہری آثار عام شہرت سمعی روایتوں سے کام لینا پڑتا تھا۔
اور بہت کم قطعی فیصلہ ہو سکتا تھا۔ اگرچہ محدثین نے ان متعارضات کے رفع کرنے کیلئے اصول
قرار دیے ہیں لیکن وہ خود اجتہادی اور مختلف ہیں۔ اس کے علاوہ متعدد موقعوں
محدثین کو خود اپنے اصول سے انحراف کرنا پڑتا ہے۔ جرح کو عموماً تعدیل پر مقدم مانا
گیا ہے لیکن بہت سے رواۃ ہیں جن کی نسبت اس قاعدہ کی پابندی نہیں کی جاتی۔
محمد بن بشار المصری احمد بن صالح مصری، عکرمہ مولیٰ ابن عباس کی نسبت مفصل جرحیں
موجود ہیں۔ تاہم ان جرحوں کا اعتبار نہیں کیا جاتا۔ تعجب یہ ہے کہ جارحین و معدلین
دونوں ائمۂ فن ہوتے ہیں اور ان کا راویوں میں اس قدر اختلاف ہوتا ہے جس سے
سخت تعجب پیدا ہوتا ہے۔ جابر جعفی کوفی ایک مشہور راوی ہے جس کو دعویٰ تھا کہ مجھ کو
پچاس ہزار حدیثیں یاد ہیں اس کی نسبت ائمہ جرح و تعدیل کی یہ رائیں ہیں۔
سفیان کا قول ہے کہ میں نے جابر سے زیادہ محتاط حدیث میں نہیں دیکھا
شعبہ کہتے ہیں کہ جابر جب اَخْبَرَنَا وَحَدَّثَنَا کہیں تو وہ اوثق الناس ہیں۔ امام سفیان
ثوری نے شعبہ سے کہا کہ اگر تم جابر جعفی میں گفتگو کرو گے تو میں تم میں گفتگو کروں گا
وکیع کا قول ہے کہ تم لوگ اور کسی بات میں شک کرو تو کرو۔ لیکن اس بات میں کچھ شک
نہ کرنا کہ جابر جعفی ثقہ ہیں۔ اس کے مقابلہ میں اور ائمۂ فن کی رائیں ہیں جن کے یہ الفاظ
ہیں کہ وہ متروک ہے کذاب ہے وضاع ہے۔ چنانچہ اخیر فیصلہ جو پچھلے محدثوں
نے کیا وہ یہی ہے کہ جابر کی روایت قابل اعتبار نہیں۔
اس سے یہ غرض نہیں کہ جرح و تعدیل کا فن ناقابل اعتبار ہے۔ بلکہ یہ مقصود

ہے کہ جن وسائل اور طریق سے رجال کے حالات قلمبند کئے گئے اور کئے جا سکتے تھے ان کا مرتبہ ظن غالب یا محض ظن سے فائق نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اس پر یقینیات اور قطعیات کی بنیاد نہیں قائم ہو سکتی۔

ادائے مطلب

ان امور کے بعد تادیہ معنے کی بحث باقی رہتی ہے۔ مثلاً ایک حدیث تمام محدثین اور مجتہدین کے اصول کے موافق متصل بھی ہے، رواۃ بھی ثقہ ہیں، شذوذ بھی نہیں ہے لیکن یہ بحث اب بھی باقی ہے کہ راوی نے ادائے مطلب کیونکر کیا؟ موقع؟ موقع اور محل روایت کی تمام خصوصیتیں ملحوظ رکھیں یا نہیں؟ فہم مطلب یا طریقہ ادا میں تو کوئی غلطی نہیں کی۔ چونکہ یہ مسلم ہے کہ حدیثیں اکثر بالمعنیٰ روایت کی گئی ہیں اس لئے احتمالات کو زیادہ قوت ہو جاتی ہے۔ صحابہ کے زمانہ کسی روایت کی صحت سے انکار کیا جاتا تھا تو اسی بنا پر کیا جاتا تھا۔ ورنہ یہ ظاہر ہے کہ صحابہ عموماً ثقہ تھے اور ان کی روایت میں انقطاع کا کوئی احتمال نہ تھا۔ صحیح مسلم باب التیمم میں ہے کہ ایک شخص نے حضرت عمر رض سے مسئلہ دریافت کیا کہ مجھ کو غسل کی حاجت ہوئی اور پانی نہ مل سکا۔ حضرت عمر رض نے فرمایا کہ نماز نہ پڑھو۔ عمار موجود تھے انھوں نے اس مسئلہ کے متعلق رسول اللہ صلعم سے ایک روایت بیان کی اور کہا کہ اس موقعہ پر آپ بھی موجود تھے۔ حضرت عمر رض نے کہا اتق اللہ یا عمار (یعنی اے عمار! خدا سے ڈرو) یہ ظاہر ہے کہ حضرت عمر رض عمار کو کاذب الروایۃ نہیں سمجھتے تھے لیکن اس احتمال پر کہ شاید ادائے مطلب میں غلطی ہوئی یہ الفاظ فرمائے چنانچہ عمار رض نے کہا کہ "اگر آپ کی مرضی نہ ہو تو یہ حدیث روایت نہ کیا کروں۔"

اخبار احاد کی بحث کو ہم نے قصداً اس لئے طول دیا کہ محدثین زیادہ تر اسی مسئلہ کی وجہ سے امام ابوحنیفہ پر ردو قدح کرتے ہیں حالانکہ امام صاحب کا مذہب نہایت تحقیق اور دقت نظر پر مبنی ہے۔

یہ تمام احتمالات اور اجتہادات اخبار احاد کے ساتھ مخصوص ہیں۔ متواتر اور مشہور میں ان بحثوں کا ساتھ نہیں۔ انھیں وجوہ اور اسباب سے اخبار احاد کے

متعلق مختلف رائیں پیدا ہوگئیں۔ معتزلہ نے تو سرے سے انکار کیا۔ ان کے مقابلہ میں بعض محدثین نے یہ شدت کی کہ خبر واحد کو قطعی قرار دیا صرف یہ شرط لگائی کہ رواۃ ہوں اور انقطاع و شذوذ و علت نہ ہو۔ بعض محدثین اگرچہ اصول کے طور پر اخبار احاد کو ظنی کہتے ہیں۔ لیکن جزئیات احکام اور مسائل اعتقادی میں اس کا خیال نہیں رکھتے۔ امام ابوحنیفہ نے اس بحث میں جو مسلک اختیار کیا وہ نہایت معتدل اور ان کی دقت نظر کی بڑی دلیل ہے۔ انھوں نے نہ معتزلہ کی طرح سرے سے انکار کیا نہ ظاہر بینوں کی طرح خوش اعتقادی سے اس کی قطعیت تسلیم کی۔ امام صاحب کی یہ رائے

خبر واحد قطعی ہے

کے موافق ہے۔ حضرت عمرؓ حضرت عائشہؓ عبداللہ بن مسعودؓ نے متعدد موقعوں پر خبر واحد کی تسلیم میں تردد کیا ہے جس کی وجہ یہی تھی کہ وہ اخبار احاد کو قطعی نہیں سمجھتے تھے فاطمہ بنت قیس نے حضرت عمرؓ کے سامنے رسول اللہؐ سے روایت کی کہ لا سکنیٰ ولا نفقۃ تو حضرت عمرؓ نے فرمایا لا نترک کتاب اللہ بقول امرأۃ [illegible] لا ندری اصدقت ام کذبت (یعنی ایک عورت کی بنا پر جس کی نسبت معلوم نہیں کہ اس نے غلط کہا یا صحیح ہم کتاب الٰہی کو چھوڑ نہیں سکتے" فقہی احکام میں اس قاعدہ پر متعدد تفریعیں ہیں۔ مثلاً یہ کہ اخبار احاد سے حکم کا فرض ہونا نہیں ثابت ہو سکتا کیونکہ فرضیت ثبوت قطعی کی محتاج ہے البتہ اس سے ظن غالب پیدا ہوتا تھا اس لئے وجوب، تسنن، استحباب ثابت ہو سکتا ہے۔ اسی بنا پر نماز میں قرأت فاتحہ کو امام شافعی فرض سمجھتے اور امام ابوحنیفہؒ واجب۔ اس پر بہت سے احکام متفرع ہیں۔

خبر واحد پر بعض صحابہ نے شک کیا ہے

فقہ سے زیادہ اس قاعدہ کا اثر علم کلام پر پڑتا ہے اور یہی چیز ہے جس نے ایک زمانہ کو امام ابوحنیفہؒ کا مخالف بنا دیا تھا۔ امام صاحب نے مذکورہ بالا قاعدہ کی بنا پر یہ اصول قرار دیا تھا کہ جو مسائل اور عقائد اسلام میں متفق علیہ ہیں ان کے خلاف اخبار احاد قابل اعتبار نہیں۔ مثلاً انبیاء کی عصمت اہل حق کا ایک مسلّم مسئلہ ہے۔ اس کے برخلاف جن روایتوں سے انبیاء کا مرتکب کبائر ہونا ثابت ہوتا ہے امام ابوحنیفہؒ کے اصول کے موافق وہ روایتیں قابل اعتبار نہیں۔ اس اصول کی بنا پر

اشکالات سے جو ملاحدہ پیش کرتے ہیں نجات ملتی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اکثر ارباب روایت نے اس عمدہ اصول کی قدر نہ کی بلکہ الٹی اور مخالفت کی۔ علامہ ابن عبدالبر نے جو مشہور محدث ہیں کتاب العلم میں لکھا ہے کان مذهب الامام ابی حنیفة فی اخبار الاحاد ان لا یقبل منها المخالف لاصول المجمع علیها فانکر علیها اصحاب الحدیث فافرطوا۔ یعنی اخبار اخبار میں احاد میں امام ابو حنیفہ رح کا یہ مذہب تھا کہ اصول متفق علیہ کے خلاف ہو تو قابل قبول نہیں۔ اس پر اصحاب حدیث نے ان کی مخالفت کی افراط کو پہنچا دیا۔

محدثین اور امام ابو حنیفہ کے اصول میں عملاً یہ فرق ہے کہ جو حدیث اصول منظوم علیہ کے خلاف ہوتی تھی محدثین اس کی صحت کو تسلیم کر کے تاویل سے کام لیتے تھے حالانکہ اکثر جگہ بارد و تاویل ہوتی۔ بخلاف اس کے امام صاحب اس طرف مائل ہوتے تھے کہ چونکہ وہ حدیث متواتر اور مشہور نہیں ہے اس لئے ممکن ہے کہ رواۃ نے غلطی یا مسامحت کی ہو۔ امام فخر الدین رازی نے تفسیر کبیر میں ایک بحث لکھی ہے جو اس موقع کی ایک عمدہ مثال ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایک شخص سے میں نے کہا یہ حدیث جس میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم تین بار جھوٹ بولے ما کذب ابراهیم الا ثلاث کذبات صحیح نہیں۔ کیونکہ اس سے حضرت ابراہیمؑ کا (نعوذ باللہ) کاذب ہونا لازم آتا ہے۔ اس شخص نے کہا اس حدیث کے رواۃ ثقہ ہیں ان کو کاذب کیونکر کہا جائے؟ میں نے جواب دیا کہ حدیث کو صحیح مانیں تو حضرت ابراہیمؑ کا کذب لازم آتا ہے اور غلط تسلیم کریں تو راوی کو کاذب ماننا پڑتا ہے۔ لیکن یہ بدیہی بات ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو راوی پر ترجیح ہے۔ امام رازی کا استدلال امام ابو حنیفہ رح کے اسی خیال پر مبنی ہے۔ یعنی چونکہ انبیاء کا معصوم اور صادق ہونا متفق علیہ ہے اس لئے خبر واحد اس کے متعارض نہیں ہو سکتی افسوس ہے کہ محدث قسطلانی صحیح بخاری کی شرح استدلال کو نقل کر کے لکھتے ہیں کہ جب رواۃ ثقہ ہیں تو حدیث کو بہر حال صحیح ماننا چاہئے۔ اسی اصول پر امام صاحب اس بات کے قائل ہیں کہ "بسم اللہ الرحمن الرحیم ہر سورت کے شروع میں جزو قرآن نہیں۔" امام شافعی رح اور

بعض محدثین اس کے خلاف ہیں اور سند میں چند حدیثیں پیش کرتے ہیں۔ امام ابو حنیفہ رح
کی طرف سے اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن متواتر سے ثابت ہے اور جو تواتر سے ثابت ہے
وہی قرآن ہے اخبار احاد سے قرآن نہیں ثابت ہو سکتا۔ اسی طرح امام صاحب کے اصول
کے مطابق وہ روایتیں قابل اعتبار نہیں ان میں عبداللہ مسعود رض کی طرف معوذتین کا انکار منسوب
کیا گیا ہے۔ حافظ ابن حجر نے ان روایتوں کو صحیح تسلیم کیا ہے اور کہا ہے روایت سے انکار
نہیں کرنا چاہیئے کہ معوذتین متواتر نہیں ہیں یا تو ان کا رتبہ گھٹتا نہ ہو گا کہ رسول اللہ کے
اصحاب کو بھی اس سے واقف ہونا ضرور نہ ہوا امام صاحب کے اس اصول کے مطابق
اسلام کا دائرہ اس قدر وسیع رہتا ہے جسقدر کہ اس کو رہنا چاہیئے۔ بخلاف اسکے
اور لوگوں کی رائے کے مطابق اس کی وسعت نقطہ سے بھی کم رہ جاتی ہے۔ مثلاً یہ مسلم اور
یقینی ہے کہ جو شخص توحید اور نبوت کا قائل ہے اور دل سے اس پر اعتقاد رکھتا ہے وہ قرآن
مجید کی نص کے مطابق مسلمان ہے۔ اب اس کے مقابلہ میں وہ حدیثیں جو قطعی الثبوت
نہیں ہیں اور جن میں بہت سے خارجی امور پر کفر کا حکم دیا گیا ہے کچھ اثر پیدا نہیں کر سکتیں
اسی بنا پر امام صاحب معتزلہ، قدریہ، جہمیہ وغیرہ کو کافر نہیں کہتے تھے اور اس قسم کی
حدیثوں کا "بہتر فرقوں میں سے صرف ایک فرقہ بہشتی ہے اور باقی دوزخی" اعتبار نہیں
کرتے تھے۔ لیکن بہت سے ظاہر بینوں نے ان حدیثوں کا یہ رتبہ قائم کیا کہ ان کی بنا پر
بات بات پر کفر کے فتوے دیے۔ یہاں تک کہ جو شخص وضع قطع میں ذرا بھی کسی دوسرے
کے مشابہ ہو جائے وہ کافر ہے۔ خود متاخرین حنفیہ نے امام صاحب کے اس عمدہ اصول
کو نظر انداز کر دیا اور سینکڑوں ہزاروں مسائل کفر کے ایجاد کر دیے جن کی تفصیل سے فقہ کی
کتابیں مالا مال ہیں۔

فقہ

اسلامی علوم مثلاً تفسیر، حدیث، مغازی ان کی ابتدا اگرچہ اسلام کیساتھ
ساتھ ہوئی۔ لیکن جس وقت ان کو فن کی حیثیت نہیں حاصل ہوئی وہ کسی خاص

کی طرف منسوب نہیں ہوئے۔ دوسری صدی کے اوائل میں تدوین و ترتیب
ہوئی ہے اور جن لوگوں نے تدوین و ترتیب کی وہ ان علوم کے بانی کہلائے چنانچہ
بانیٔ فقہ کا لقب امام ابو حنیفہ رح کو ملا جو درحقیقت اس لقب کے سزاوار تھے اگر
ارسطو علم منطق کا موجد ہے تو بے شبہہ امام ابو حنیفہ رح بھی علم فقہ کے موجد ہیں امام
صاحب کی علمی زندگی کا بڑا کارنامہ فقہ ہی ہے اس لئے ہم اس پر تفصیلی بحث کرنی
چاہتے ہیں۔ لیکن اصل مقصد سے پہلے ضرور ہے کہ مختصر طور پر ہم علم فقہ کی تاریخ لکھیں
جس سے ظاہر ہو کہ یہ علم کب شروع ہوا اور کیونکر شروع ہوا اور خاصکر یہ کہ امام
ابو حنیفہ رح نے جب اس کو پایا تو اس کی کیا حالت تھی۔

فقہ کی مختصر تاریخ

فقہ کی تاریخوں پر شاہ ولی اللہ صاحب نے ایک نہایت عمدہ تر مضمون لکھا
ہے جس کا التقاط ہمارے لئے کافی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم کے زمانے میں احکام
کی قسمیں نہیں پیدا ہوئی تھیں۔ آنحضرتؐ اصحاب کے سامنے وضو فرماتے تھے اور
کچھ نہ بتلاتے تھے کہ یہ رکن ہے یہ واجب ہے یہ مستحب ہے۔ صحابہ آپ کو دیکھ کر
اسی طرح وضو کرتے تھے نماز کا بھی یہی حال تھا۔ یعنی صحابہ فرض و واجب وغیرہ
کی تفصیل و تدقیق نہیں کیا کرتے تھے جس طرح رسول اللہ کو نماز پڑھتے دیکھا
خود بھی پڑھ لی۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ میں نے کسی قوم کو رسول اللہ صلعم کے اصحابؓ
سے بہتر نہیں دیکھا لیکن انھوں نے رسول اللہ صلعم کی تمام زندگی میں تیرہ مسئلوں سے
زیادہ نہیں پوچھے جو سب کے سب قرآن میں موجود ہیں۔ البتہ جو واقعات غیر
معمولی طور پر سے پیش آتے تھے ان میں لوگ آنحضرتؐ سے استفسار کرتے اور آں
حضرتؐ جواب دیتے اکثر ایسا بھی ہوتا کہ لوگوں نے کوئی کام کیا آپ نے اس پر
تحسین کی یا اس سے ناراضمندی ظاہر کی۔ اس قسم کے تمام فتوے اکثر عام مجمعوں
میں ہوتے تھے اور لوگ آنحضرتؐ کے اقوال کو ملحوظ رکھتے تھے۔

آنحضرتؐ کی وفات کے بعد فتوحات کو نہایت وسعت ہوئی اور تمدن کا
دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ واقعات اس کثرت سے پیش آئے کہ استنباط و اجتہاد کی

ضرورت پڑی اور اجمالی احکام کی تفصیل پر متوجہ ہونا پڑا۔ مثلاً کبھی شخص نے غلطی سے نماز میں کوئی عمل ترک کر دیا۔ اب بحث یہ پیش آئی کہ نماز ہوئی یا نہیں؟ اس بحث کے پیدا ہونے کے ساتھ یہ تو ممکن نہ تھا کہ نماز میں جس قدر اعمال تھے سب کو فرض کہہ دیا جاتا، صحابہ کو تفریق کرنی پڑی کہ نماز میں کتنے ارکان فرض و واجب ہیں۔ کتنے مسنون و مستحب۔ اس تفریق کے لئے جو اصول قرار دیے جا سکتے تھے ان پر تمام صحابہ کے راویوں کا متفق ہونا ممکن نہ تھا اس لئے مسائل میں جو اختلاف آراء ہوا اور اکثر مسئلوں میں صحابہ کی مختلف رائیں قائم ہوئیں۔ بہت سے ایسے واقعات پیش آئے کہ رسول اللہ صلعم کے زمانہ میں اُن کا عین واثر بھی نہ پایا گیا۔ صحابہ کو ان صورتوں میں استنباط، تفریع، حمل النظیر علی النظیر قیاس سے کام لینا پڑا۔ ان اصول کے طریقے یکساں نہ تھے اس لئے ضروری اختلاف پیدا ہوئے غرض صحابہ ہی کے زمانہ میں احکام اور مسائل کا دفتر بن گیا اور جداجدا طریقے قائم ہو گئے۔ صحابہ میں جن لوگوں نے استنباط و اجتہاد سے کام لیا مجتہد یا فقیہ کہلاتے ان میں سے چار بزرگ نہایت ممتاز تھے۔ عمرؓ علی، عبداللہ بن مسعودؓ، عبداللہ بن عباسؓ۔ حضرت علیؓ و عبداللہ بن مسعودؓ زیادہ تر کوفہ میں رہے اور رہ ہیں ان کے احکام کی زیادہ تر ترویج ہوئی۔ اس کے تعلق سے کوفہ فقہ دارالعلوم بن گیا۔ جس طرح کہ حضرت عمرؓ و عبداللہ بن عباسؓ کے تعلق سے حرمین کو دارالعلوم کا لقب حاصل ہوا تھا۔

حضرت علیؓ بچپن سے رسول اللہ صلعم کی آغوش تربیت میں پلے تھے اور جس قدر ان کو آنحضرتؐ کے اقوال و افعال سے مطلع ہونے کا موقع ملا تھا کسی کو نہیں ملا تھا۔ ایک شخص نے اُن سے پوچھا کہ آپ اور صحابہ کی نسبت کثیر الروایۃ کیوں ہیں؟ فرمایا کہ میں آنحضرتؐ سے کچھ دریافت کرتا تھا تو بتاتے تھے اور چپ رہتا تھا تو خود ابتدا کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ذہانت، قوت استنباط بلکہ استخراج ایسا بڑھا ہوا تھا کہ عموماً صحابہ اعتراف کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ کا عام قول تھا کہ "خدا نہ کرے کہ کوئی مشکل مسئلہ آن پڑے اور علیؓ موجود نہ ہوں"۔ عبداللہ بن عباسؓ خود مجتہد تھے مگر کہا کرتے تھے کہ جب ہم کو علیؓ کا فتویٰ مل جائے تو اور کسی چیز کی ضرورت نہیں۔

فقہ صحابہ مجتہدین

فقہ حضرت علیؓ

عبداللہ بن مسعودؓ بھی حدیث و فقہ دونوں میں کامل تھے۔ رسول اللہؐ کے ساتھ جلوت و خلوت میں ہمدم و ہمراز رہے تھے بہت کم لوگ رہے ہوں گے۔ صحیح مسلم میں ابو موسیٰؓ سے روایت ہے کہ ہم یمن سے آئے اور کچھ دنوں تک (مدینہ میں) رہے ہم نے عبداللہ بن مسعودؓ کو رسول اللہؐ کے پاس اس کثرت سے آتے جاتے دیکھا کہ قرآن مجید میں کوئی آیت ایسی نہیں ہے جس کی نسبت وہ یہ نہ جانتے ہوں کہ کس باب میں اتری ہے" وہ کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص قرآن مجید کا مجھ سے زیادہ عالم ہوتا تو میں اس کے پاس سفر کر کے جاتا۔ صحیح مسلم میں ہے کہ انھوں نے ایک مجمع میں دعویٰ کیا کہ تمام صحابہ جانتے ہیں کہ میں قرآن کا سب سے زیادہ عالم ہوں۔ شفیق اس جلسہ میں موجود تھے وہ کہتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد میں اکثر صحابہ کے حلقوں میں شریک ہوا۔ مگر کسی کو عبداللہ بن مسعودؓ کے دعوے کا منکر نہیں پایا۔

عبداللہ بن مسعودؓ باقاعدہ طور پر حدیث و فقہ کی تعلیم دیتے تھے اور انکی درسگاہ میں بہت سے تلامذہ کا مجمع رہتا تھا جس میں چند شخص یعنی اسود، عبیدہ، حارث، علقمہ نہایت نامور ہوئے۔ علقمہ رسول اللہؐ کی زندگی میں پیدا ہوئے تھے اور حضرت عمرؓ، عثمانؓ علیؓ، عائشہؓ، سعدؓ، حذیفہؓ، خالد بن ولیدؓ، ابوالدرداءؓ اور بہت سے صحابہؓ سے حدیثیں روایت کیں۔ خاصکر عبداللہ بن مسعودؓ کی صحبت میں اس التزام سے رہے تھے اور ان کے اطوار طریق سے اس قدر قدم بقدم چلتے تھے کہ لوگوں کا قول تھا کہ جس نے علقمہ کو دیکھ لیا اس نے عبداللہ بن مسعودؓ کو دیکھ لیا۔ خود عبداللہ بن مسعودؓ کا قول تھا کہ جس قدر علقمہ کو معلومات ہیں میری معلومات اس سے زیادہ نہیں ہیں اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ صحابہ ان سے مسائل دریافت کرنے آتے تھے۔ عبداللہ بن مسعودؓ کے شاگردوں میں اگر کوئی شخص علقمہ کا ہمسر تھا تو اسود تھے۔

ابراہیم نخعی رح

علقمہ و اسود کے انتقال کے بعد ابراہیم نخعی مسند نشین ہوئے اور فقہ کو بہت کچھ وسعت دی یہاں تک کہ ان کو فقیہ العراق کا لقب ملا۔ علم حدیث میں ان کا یہ پایہ تھا کہ خبر فی الحدیث کہلاتے تھے۔ امام شعبی نے جو علامۃ التابعین کے لقب سے ممتاز ہیں

ان کی وفات کے وقت کہا " ابراہیمؒ نے کسی کو نہیں چھوڑا جو ان سے زیادہ عالم اور فقیہ ہو "۔ اس پر ایک شخص نے تعجب سے پوچھا کہ کیا حسن بصریؒ اور ابن سیرین بھی؟ شعبی نے کہا حسن بصریؒ اور ابن سیرین پر کیا ختم ہے۔ بصرہ، کوفہ، شام، حجاز میں کوئی شخص ان سے زیادہ عالم نہیں رہا۔ ابراہیم نخعی کے عہد میں مسائل فقہ کا ایک مختصر مجموعہ تیار ہو گیا جس کا ماخذ حدیث نبوی اور حضرت علیؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ کے فتوے تھے۔ یہ مجموعہ گو مرتب طور پر قلم بند نہیں کیا گیا لیکن ان کے شاگردوں کو اس کے مسائل زبانی یاد تھے۔ سب سے زیادہ یہ مجموعہ حماد کے پاس جمع تھا جو ابراہیم کے تلامذہ میں نہایت ممتاز تھے۔ چنانچہ ان کے مرنے کے بعد فقہ کی مسند خلافت بھی انہی کو ملی۔ حماد نے ۱۲۰ھ میں قضا کی اور لوگوں نے ان کی جگہ امام ابوحنیفہ رح کو فقہ کی مسند پر بٹھایا۔

امام صاحب کے زمانہ تک اگرچہ فقہ کے معتد بہ مسائل مدوّن ہو چکے تھے۔ لیکن اولاً تو یہ تدوین صرف زبانی روایت تھی دوسرے جو کچھ تھا فن کی حیثیت سے نہ تھا نہ استنباط و استدلال کے قواعد قرار تھے۔ نہ احکام کی تفریع کے اصول منضبط تھے نہ حدیثوں میں مراتب تھا نہ قیاس اور رد النظیر علی النظیر کے قاعدے مقرر تھے۔ مختصر یہ کہ فقہ جزئیات مسائل کا نام تھا اور اس کو قانون کے رتبہ تک پہنچانے کے لئے بہت سے زینے باقی تھے۔ تاریخ سے اس بات کا پتہ لگانا مشکل ہے کہ امام ابوحنیفہ رح کو خاص کس وجہ سے فقہ کی تدوین کا خیال پیدا ہوا! قلائد عقود العقیان کے مصنف نے کتاب الموذج القتال سے اس کا قصہ نقل کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ دو شخص حمام میں نہانے گئے اور حمامی کے پاس کچھ امانت رکھتے گئے، ایک ان میں سے نہا کر نکلا اور حمامی سے امانت طلب کی۔ اس نے دیدی۔ یہ لیکر چلتا بنا۔ دوسرا حمام سے باہر آیا اور امانت مانگی تو اس نے عذر کیا کہ میں نے تمہارے شریک کو حوالہ کر دی۔ اس نے عدالت میں استغاثہ کیا۔ قاضی صاحب نے حمامی کو مجرم ٹھہرایا کہ جب دونوں نے مل کر تیرے پاس

امام ابوحنیفہ رح کو فقہ کی تدوین کا خیال کیونکر پیدا ہوا تھا؟

امانت رکھی تھی تو تجھ کو ضرور تھا کہ دونوں کی موجودگی میں واپس کرتا۔ حمامی گھبرایا ہوا امام
ابوحنیفہؒ کے پاس آیا۔ امام صاحب نے کہا کہ تم جا کر اس شخص سے کہو کہ میں تمہاری امانت
ادا کرنے کے لئے تیار ہوں۔ لیکن قاعدے کے موافق تنہا تم کو نہیں دے سکتا۔ شریک کو لاؤ
تو لیجاؤ۔ اس کے واقعہ کے بعد امام صاحب کو فقہ کی تدوین کا خیال پیدا ہوا اور اس کی تدوین شروع
کر دی۔

ممکن ہے کہ یہ واقعہ صحیح ہو۔ لیکن اس خیال کے پیدا ہونے کے اصلی اسباب اور تھے
یہ امر تاریخوں سے ثابت ہے کہ امام صاحب کو تدوین فقہ کا خیال تقریباً ۱۲۰ھ میں پیدا
ہوا۔ یعنی جب ان کے استاد حماد نے وفات پائی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ اسلام کا تمدن نہایت
وسعت پکڑ گیا تھا۔ عبادات اور معاملات کے متعلق اس کثرت سے واقعات پیدا ہو گئے
تھے اور ہوتے جاتے تھے کہ ایک مرتب مجموعہ قانون کے بغیر کسی طرح کام نہیں چل سکتا تھا۔
نیز سلطنت اور دوسری قوموں کے میل جول سے تعلیم و تعلم نے اس قدر وسعت حاصل
کر لی تھی کہ زبانی سند روایت اس کا تحمل نہیں کر سکتی تھی۔ ایسے وقت پر قدرتی طور پر یہ
لوگوں کے دل میں خیال آیا ہوگا کہ ان جزئیات کو اصول کے ساتھ ملا کر ایک فن بنا دیا
جائے۔

امام ابوحنیفہؒ کی طبیعت مجتہدانہ اور غیر معمولی طور پر منقبانہ واقع ہوئی تھی اس کے
ساتھ تجارت کی وسعت اور ملکی تعلقات نے معاملات کی ضرورتوں سے خبردار کر دیا تھا۔
اطراف بلاد سے جو سینکڑوں استفتار آتے تھے ان سے ان کو اندازہ ہوتا تھا کہ ملک کو
اس فن کی کس قدر حاجت ہے قضاۃ اور حکام فصل قضایا میں جو غلطیاں کرتے تھے
وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے۔

غرض یہ اسباب اور وجوہ تھے جنہوں نے ان کو اس فن کی تدوین اور ترتیب پر
آمادہ کیا۔ ممکن ہے کہ کسی خاص واقعہ سے جیسا کہ اوپر مذکور ہوا اس آمادگی کو اور تحریک
ہوئی ہو جس کے ساتھ عملی کوشش کا ظہور ہوا ہو۔

امام صاحب نے جس طریقے سے فقہ کی تدوین کا ارادہ کیا وہ نہایت وسیع اور پرخطر

کام تھا۔ اس لئے انھوں نے اتنے بڑے کام کو اپنی رائے اور معلومات پر منحصر کرنا نہیں چاہا۔ اس غرض سے انھوں نے اپنے چند نامور شخص منتخب کئے جن میں اکثر خاص فنون میں جو تکمیل فقہ کے لئے ضروری تھے استاد زمانہ تسلیم کئے جاتے تھے مثلاً یحییٰ بن ابی زائدہ، حفص بن ابی غیاث، قاضی ابو یوسف، داؤد الطائی، حبان، مندل، حدیث و آثار میں نہایت کمال رکھتے تھے۔ امام زفر قوت استنباط میں مشہور تھے۔ قاسم بن معن اور امام محمد کو ادب اور عربیت میں کمال رکھتے تھے۔ امام صاحب نے ان لوگوں کی شرکت سے ایک مجلس مرتب کی اور باقاعدہ طور سے فقہ کی تدوین شروع ہوئی۔ امام طحاوی نے بسند متصل اسد بن فرات سے روایت کی ہے کہ ابو حنیفہ کے تلامذہ جنھوں نے فقہ کی تدوین کی چالیس تھے جن میں یہ لوگ زیادہ ممتاز تھے۔ ابو یوسف، زفر، داؤد الطائی، اسد بن عمر، یوسف بن خالد التیمی، یحییٰ بن ابی زائدہ۔ امام طحاوی نے یہ بھی روایت کی ہے کہ لکھنے کی خدمت یحییٰ سے متعلق تھی اور وہ تیس برس تک اس خدمت کو انجام دیتے رہے اگرچہ یہ صحیح ہے کہ اس کام میں کم و بیش تیس برس کا زمانہ صرف ہوا یعنی سنہ۱۲۱ھ سے سنہ۱۵۰ھ تک جو امام ابو حنیفہ رح کی وفات کا سال ہے۔ لیکن یہ غلط ہے کہ یحییٰ شروع سے اس کام میں شریک تھے۔ یحییٰ ۱۲۰ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ اس لئے وہ شروع سے کیونکر شریک ہو سکتے تھے۔ طحاوی نے جن لوگوں کے نام گنائے ہیں ان کے سوا عافیہ ازدی، ابو علی عزدی، علی مسہر، قاسم بن معن، حبان، مندل بھی اس مجلس کے ممبر رہے۔

تدوین کا طریق یہ تھا کہ کسی خاص باب کا کوئی مسئلہ پیش کیا جاتا تھا۔ اگر اس کے جواب میں سب لوگ متفق الرائے ہوتے تو اسی وقت قلمبند کر لیا جاتا ورنہ نہایت آزادی سے بحثیں شروع ہوتیں۔ کبھی کبھی بحث دیر تک بحث قائم رہتی۔ امام صاحب بہت غور اور تحمل کے ساتھ سب کی تقریریں سنتے اور بالآخر ایسا جچا تلا فیصلہ کرتے کہ سب کو تسلیم کرنا پڑتا کبھی ایسا بھی ہوتا کہ امام صاحب کے فیصلہ کے بھی بعد لوگ اپنی اپنی رایوں پر قائم رہتے اس وقت وہ سب مختلف اقوال قلمبند کر لئے جاتے۔ اس کا التزام تھا کہ جب تک تمام شرکاء جلسہ جمع نہ ہو لیں کسی مسئلہ کو طے نہ کیا جائے۔

فقہ کی تدوین میں ایک مجلس

جواہر مضئیہ کے مصنّف نے عافیہ بن یزید کے تذکرہ میں اسحٰق سے روایت کی ہے کہ امام ابوحنیفہ رح کے اصحاب کسی مسئلہ میں بحث کرتے ہوتے اور عافیہ موجود نہ ہوتے تو امام صاحب فرماتے کہ عافیہ کو آلینے دو۔ جب وہ آلیتے اور اتفاق کرتے تب وہ مسئلہ درج تحریر کیا جاتا۔ اس طرح تیس برس کی مدت میں یہ عظیم الشان کام انجام کو پہنچا۔ امام صاحب کی اخیر عمر قید خانہ میں گذری وہاں بھی یہ کام برابر جاری رہا۔

اس مجموعہ کی ترتیب جیسا کہ حافظ ابوالمحاسن نے بیان کی ہے یہ تھی۔ اول باب الطہارۃ، باب الصلوٰۃ، باب الصوم، پھر عبادت کے اور ابواب، اس کے بعد معاملات سب سے اخیر میں باب المیراث۔

امام صاحب کی زندگی ہی میں اس مجموعہ نے وہ حسن قبول حاصل کیا کہ اس وقت کے حالات کے لحاظ سے مشکل سے قیاس میں آسکتا ہے۔ جس قدر اس کے اجزاء تیار ہوتے جاتے تھے ساتھ ہی ساتھ تمام ملک میں اس کی اشاعت ہوتی جاتی تھی۔ امام صاحب کا درسگاہ ایک قانونی مدرسہ تھا جس کے طلباء نہایت کثرت سے ملکی عہدوں پر مامور ہوئے اور ان کی آئین حکومت کا یہی مجموعہ تھا۔ تعجب یہ ہے کہ جن لوگوں کو امام صاحب کی ہمسری کا دعویٰ تھا وہ بھی اس کتاب سے بے نیاز نہ تھے۔ امام ابوسفیان ثوری نے بڑے لطائف الحیل سے کتاب الرہن کی نقل حاصل کی اور اس کو اکثر پیش نظر رکھتے تھے۔ زائدہ کا بیان ہے کہ میں نے ایک دن سفیان کے سرہانے ایک کتاب دیکھی جس کا وہ مطالعہ کر رہے تھے۔ ان سے اجازت مانگ کر میں اس کو دیکھنے لگا تو ابوحنیفہ کی کتاب الرہن نکلی۔ میں نے تعجب سے پوچھا کہ آپ ابوحنیفہ کی کتاب دیکھتے ہیں؟ بولے "کاش ان کی سب کتابیں میرے پاس ہوتیں"

تو بھی کم تعجب کی بات نہیں کہ باوجودیکہ اس وقت بڑے بڑے مدعیان فن موجود تھے اور ان میں بعض امام ابوحنیفہ سے مخالفت بھی رکھتے تھے تاہم کسی کو اس کتاب کی رد و قدح کی جرأت نہیں ہوئی۔ امام رازی مناقب الشافعی میں لکھتے ہیں ان اصحاب الرای اظہروا مذہبہم وکانت البلاد مملوۃ من المحدثین ورواۃ الاخبار

ولم یقدر احد منہم الطعن فی اقاویل اصحاب الرای۔ (یعنی الرائے (ابوحنیفہ رح اور ان تلامذہ نے اپنے مسائل جس زمانہ میں ظاہر کئے دنیا محدثین اور راویان اخبار سے بھری ہوئی تھی تاہم کسی کو یہ قدرت نہ ہوئی کہ ان کے قول پر اعتراض کرتا۔"
امام رازی نے تو عام نفی کی ہے لیکن ہم کو زیادہ استفسار سے معلوم ہوا ہے کہ اس عموم میں ایک استثنار ہے کیونکہ بیہقی نے تصریح کی ہے کہ امام اوزاعی نے امام ابوحنیفہ کی کتاب السیر کا رد لکھا تھا جس کا جواب قاضی ابو یوسف نے لکھا۔

غرض یہ مجموعہ بہت بڑا مجموعہ تھا اور ہزاروں مسائل پر مشتمل تھا۔ قلائد عقود العقیان کے مصنف نے کتاب الصیانۃ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہ نے جس قدر مسائل مدوّن ان کی تعداد بارہ لاکھ نوے ہزار سے کچھ زیادہ ہے "شمس الائمہ کردری نے لکھا ہے کہ" یہ مسائل چھ لاکھ تھے۔" یہ خاص تعداد شاید صحیح نہ ہو لیکن کچھ شبہ نہیں کہ ان کی تعداد لاکھوں سے کم نہ تھی۔ امام محمد کی جو کتابیں آج موجود ہیں ان سے ان کی تصدیق ہو سکتی ہے۔

اگرچہ اس میں کسی طرح شبہہ نہیں ہو سکتا کہ امام ابوحنیفہ کی زندگی ہی میں فقہ کے تمام ابواب مرتب ہو گئے تھے۔ رجال و تاریخ کی کتابوں میں اس کا ثبوت ملتا ہے کہ جس کا انکار تواتر گویا تواتر کا انکار ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ وہ مجموعہ ایک مدت سے ضائع ہو گیا ہے اور دنیا کے کسی کتب خانے میں اس کا پتہ نہیں چلتا۔ امام رازی مناقب الشافعی میں لکھتے ہیں کہ ابوحنیفہ کی کوئی تصنیف باقی نہیں رہی۔ امام رازی نے ۶۰۶ھ میں انتقال کیا۔ اس لحاظ سے کم از کم چھ سو برس ہوئے کہ امام صاحب کی تصنیفات ناپید ہو چکیں۔ امام صاحب کی تصنیفات کا ضائع ہو جانا اگرچہ کچھ محل تعجب نہیں اس عہد کی ہزاروں کتابوں میں آج ایک کا بھی وجود نہیں۔ امام اوزاعی ابن جریج، ابن عروبہ، حماد بن ابی معمر، ان کی تالیفات عین اس زمانہ میں شائع ہوئیں جب امام ابوحنیفہ کا دفتر فقہ مرتب ہو چکا تھا۔ تاہم ان کتابوں کا نام بھی کوئی نہیں جانتا لیکن امام ابوحنیفہ کی گمشدگی کی ایک خاص وجہ ہے۔ امام صاحب کا مجموعہ فقہ

اگرچہ بجائے خود مرتب و خوش اسلوب تھا لیکن قاضی ابو یوسف و امام محمد نے انہیں مسائل کو اس توضیح و تفصیل سے لکھا اور ہر مسئلہ پر استدلال و براہان کے ایسے حاشیے اضافہ کئے کہ انھیں کو رواج عام ہو گیا اور اصل ماخذ سے لوگ بے پروا ہو گئے ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ متاخرین نحویوں کی تصنیفات کے بعد فراء، کسائی، خلیل، اخفش، ابوعبیدہ کی کتابیں دنیا سے بالکل ناپید ہو گئیں۔ حالانکہ یہ لوگ فن نحو کے بانی اور مدوّن اوّل تھے۔

امام صاحب کے مسائل کا جو ذخیرہ آج دنیا میں موجود ہے وہ امام محمد اور قاضی ابو یوسف کی تالیفات ہیں جن کے نام اور مختصر حالات اِن بزرگوں کے ترجمہ میں ہم لکھیں گے۔

یہ فقہ اگرچہ عام طور پر فقہ حنفی کہلاتا ہے لیکن درحقیقت وہ چار شخصوں یعنی امام ابوحنیفہ، زفر، قاضی ابو یوسف، امام محمد کے راویوں کا مجموعہ ہے۔ قاضی ابویوسف و امام محمد نے بہت سے مسائل میں امام ابوحنیفہ کی رائے سے اختلاف کیا ہے۔ فقہائے حنفیہ نے روایتیں نقل کی ہیں ان صاحبوں کو اعتراف تھا کہ "ہم نے جو اقوال امام ابو حنیفہ کے مخالف کہے وہ بھی امام ابوحنیفہ ہی کے اقوال تھے۔ کیونکہ بعض مسئلوں میں امام ابوحنیفہ نے متعدد اور مختلف رائیں ظاہر کی تھیں" یہ روایتیں شامی وغیرہ میں موجود ہیں لیکن ان کا ثابت ہونا مشکل ہے۔ ہمارے نزدیک یہ ان فقہا کا حسن ظن ہے۔ قاضی ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ اجتہاد مطلق کا منصب رکھتے تھے اور ان کو اختلاف کا پورا حق حاصل تھا۔ اسلام کی ترقیاں اسی وقت تک رہیں کہ لوگ باوجود حسن عقیدت کے بزرگوں اور استادوں کی رائے سے علانیہ مخالفت کرتے تھے اور خیالات کی ترقی محدود نہ تھی۔

یہ مسائل جو فقہ حنفی کے نام سے موسوم ہیں نہایت تیزی سے تمام ملک میں پھیل گئے۔ عرب میں تو چنداں ان مسائل کو رواج نہ ہوا۔ کیونکہ مدینہ میں امام مالکؒ اور مکہ میں اور ائمہ ان کے حریف مقابل موجود تھے لیکن عرب کے سوا تمام ممالک اسلامی میں

جن کی وسعت سندھ سے ایشیائے کوچک تک تھی عموماً انہیں کا طریقہ جاری ہو گیا۔ ہندوستان، سندھ، کابل، بخارا وغیرہ میں نوان کے اجتہاد کے سوا کسی کا اجتہاد تسلیم نہیں کیا جاتا۔ دوسرے ممالک میں گو شافعی و حنبلی فقہ کا رواج ہوا لیکن حنفی فقہ کو دبا نہیں سکا۔ البتہ بعض ملکوں میں وہ بالکل معدوم ہو گیا اور اس کے خاص اسباب تھے مثلاً افریقہ میں ۴۰۵ھ تک امام ابوحنیفہ کا طریقہ بہ تمام طریقوں پر غالب تھا لیکن معز بن بادیس نے ۴۰۶ھ میں جب وہاں کی مستقل حکومت قائم کی تو حکومت کے زور سے تمام ملک میں مالکی فقہ کو رواج دیا یا کہ آج تک قائم ہے[1]

ایک خاص بات یہ ہے کہ عنان حکومت جن لوگوں کے ہاتھ میں رہی وہ اکثر حنفی ہی فقہ کے پابند تھے۔ خلفائے عباسیہ تو اس بحث سے خارج ہیں۔ کیونکہ یہ خاندان جب تک اوج پر رہا یہ لوگ تلوار کے ساتھ قلم کے بھی مالک رہے یعنی ان کو خود دعوئی اجتہاد تھا اور کبھی کسی کی تقلید نہیں کی۔ تنزل کے بعد وہ اس قابل ہی نہیں رہے کہ ان کے حالات سے کسی ملکی اثر کا اندازہ کیا جائے، تاہم ان میں اگر کسی نے تقلید گوارا کی تو امام ابوحنیفہ ہی کی۔ عبداللہ بن المعتز جو فن بدیع کا موجد تھا اور خلفاء عباسیہ میں سب سے بڑا شاعر، ادیب تھا، حنفی المذہب[1] تھا۔

عباسیہ کے تنزل کے ساتھ جن خاندانوں کا عروج ہوا اکثر حنفی تھے، خاندان سلجوق جس نے ایک وسیع مدت تک حکومت کی اور جن کے دائرۂ حکومت کی وسعت طول کاشغر سے بیت المقدس تک اور عرض میں قسطنطنیہ سے بلاد اذخر تک پہنچی تھی حنفی تھا۔ محمود غزنوی جس کے نام سے ہندوستان کا بچہ بچہ واقف ہے فقہ حنفی کا بہت بڑا عالم تھا۔ فن فقہ میں اس کی ایک نہایت عمدہ تصنیف موجود ہے جس کا نام التفرید ہے جس میں کم و بیش ساٹھ ہزار مسئلے ہیں۔ نورالدین زنگی کا نام چھپا ہوا نہیں ہے وہ ہمارے ہیروز میں داخل ہے۔

سلاطین اکثر حنفی تھے

بیت المقدس کی لڑائیوں میں اوّل اسی نے نام حاصل کیا۔ صلاح الدین فاتح بیت المقدس کے دربار میں ملازم تھا۔ دنیا میں پہلا دارالحدیث اسی نے

[1] تاریخ ابن خلکان ترجمہ عبداللہ بن معتز ۱۲

قائم کیا۔ اگرچہ وہ شافعی و مالکی فقہ کی عزت کرتا تھا لیکن وہ خود اور اس کا تمام خاندان متذہباً حنفی تھا۔[1] صلاح الدین خود شافعی تھا لیکن اس کے خاندان میں بھی حنفی المذہب موجود تھے۔ الملک المعظم عیسےٰ بن الملک العادل جو ایک وسیع ملک کا بادشاہ تھا علامہ ابن خلکان اس کے حالات میں لکھتے ہیں کہ وہ نہایت عالی ہمت فاضل ہوشمند دلیر و پُر رعب تھا اور حنفی المذہب میں غُلو رکھتا تھا۔ چراکسۂ مصر جو نویں صدی کے آغاز میں مصر کی حکومت پر پہنچے اور ۴۸ ابرس تک فرماں روا رہے اور بہت سی فتوحات حاصل کیں خود حنفی تھے اور ان کے دربار میں اسی مذہب کو زیادہ فروغ تھا، سلاطین ترک جو کم و بیش چھ سو برس تک روم کے فرماں روا رہے ہیں اور آج ان کی سلطنت اسلام کی عزت و وقار کی اُمید گاہ ہے۔ عموماً حنفی تھے۔ خود ہمارے ہندوستان کے فرماں روا خوانین اور آل تیموری اسی مذہب کے پابند رہے اور ان کی وسیع سلطنت میں اس طریقہ کے سوا اور کسی طریقہ کو رواج نہ ہو سکا۔ بعضوں کا خیال ہے کہ حنفی مذہب کو جو قبول عام حاصل ہوا وہ حکومت کے صدقے سے ہوا۔ ابن حزم جو ارباب ظاہر کے مشہور امام ہیں ان کا قول ہے کہ دو مذہبوں نے سلطنت کے زور سے ابتدا ہی میں رواج عام حاصل کیا۔ ایک ابوحنیفہ کا مذہب کیونکہ جب قاضی ابویوسف کو قاضی القضاۃ کا منصب ملا تو انھوں نے حنفی لوگوں کو عہدۂ قضا پر مقرر کیا۔ دوسرا امام مالک کا مذہب اندلس میں۔ کیونکہ امام مالک کے شاگرد یحییٰ صمودی خلفاء اندلس کے نہایت مقرب تھے اور کوئی شخص بے ان کے مشورہ کے عہدۂ قضا پر مقرر نہیں ہو سکتا تھا وہ صرف اپنے ہم مذہبوں کو مقرر کرتے تھے[2]

حنفی فقہ کے حسن قبول کی وجہ

لیکن یہ ابن حزم کی ظاہر بینی ہے۔ امام ابوحنیفہ رح سنہ ۱۲۰ھ میں مسند اجتہاد پر بیٹھے قاضی ابویوسف نے سنہ ۱۷۰ھ کے بعد قاضی القضاۃ کا منصب حاصل کیا۔ کیونکہ انکے تقرر اور عروج کا زمانہ ہارون الرشید کے عہد سے شروع ہوتا ہے جو سنہ ۱۷۰ھ میں تخت نشین ہوا تھا۔ قاضی ابویوسف کے فروغ سے پہلے پچاس برس کا زمانہ گذر چکا تھا جس میں امام ابوحنیفہ کے مذہب نے قبول عام حاصل کیا تھا اور ان کے سینکڑوں شاگرد قضا کے عہدہ پر مامور ہو چکے تھے۔ اس کامیابی کو کس طرف منسوب کیا جائے۔ ؟ یہ ضرور ہے

[1] الجواہر المضیۃ ترجمہ نور الدین زنگی [2] ابن حزم کے اس قول کو علامہ ابن خلکان نے یحییٰ صمودی کے ترجمہ میں نقل کیا ہے۔ ۱۲

کہ قاضی ابو یوسف کی وجہ سے امام صاحب کے مسائل کو اور زیادہ عروج ہوا لیکن مذہب حنفی رح کا اصلی عروج قاضی صاحب کی کوششوں کا محتاج نہ تھا۔ امام رازی جیسا نے باوجود مخالفت کے تسلیم کیا ہے کہ ثم انہ لما قوی مذہب اصحاب الرای واشتہر و عظم وقعتہ فی الصوب ثم اتفق انصال ابی یوسف و محمد بخدمۃ ھارون الرشید عظمت تلک القوۃ حتی ان العلم والسلطنۃ حصلا۔ یعنی اصحاب الرائے کا مذہب قوی ہو گیا اور شہرت پکڑ گیا اور اس کی وسعت دلوں میں بہت ہو گئی۔ پھر اس کے بعد ابو یوسف و محمد کو ہارون الرشید کے دربار میں رسائی حاصل ہوئی تو یہ قوت بہت ہی زیادہ بڑھ گئی۔ کیونکہ علم اور حکومت دونوں مجتمع ہو گئے۔

اسکے علاوہ قاضی ابو یوسف کا اثر ہارون الرشید کے زمانہ تک محدود تھا دیر پا اور غیر منقطع کامیابی کس نے پیدا کی؟ یوں تو اور بعض ائمہ نے بھی اپنے عہد میں نہایت رسوخ حاصل کیا تھا۔ امام اوزاعی اپنی زندگی میں بلکہ زمانہ مابعد تک بھی تمام شام کے امام مطلق تسلیم کئے گئے اور ان ممالک میں لوگ عموماً انہی کی تقلید کرتے۔ لیکن وہ ایک محدود اثر تھا جو بہت جلد جاتا رہا۔ ان واقعات سے صاف نتیجہ نکلتا ہے کہ امام ابو حنیفہ رح کے مذہب میں ایسی خاص خوبیاں ہیں جو اور مذہبوں میں نہیں۔

تمام ممالک اسلامی میں جن ائمہ کی فقہ نے رواج پایا وہ صرف چار ہیں ابو حنیفہ رح مالک رح۔ شافعی رح۔ احمد حنبل رح۔ مسائل فقہ کی ترویج و اشاعت کا سبب اگرچہ خود ان مسائل کی خوبی و عمدگی ہے لیکن کچھ شبہہ نہیں کہ اس امر میں واضع فقہ کی ذاتی رسوخ اور عظمت کو بھی بہت کچھ دخل ہے ہمارے نزدیک امام ابو حنیفہ رح کے سوا اور مجتہدین فقہ ترویج و اشاعت کا باعث زیادہ تر ان کی ذاتی خصوصیتیں تھیں۔ مثلاً امام مالک مدینے کے رہنے والے تھے جو نبوت کا مرکز اور خلفائے راشدین کا دار الخلافہ رہ چکا تھا اس تعلق سے لوگوں کو عموماً مدینہ اور ارباب مدینہ سے خلوص و عقیدت تھی۔ ان کا خاندان ایک علمی خاندان تھا۔ ان کے دادا مالک بن ابی عامر نے بڑے بڑے صحابہ سے

حدیثیں سیکھی تھیں۔ ان کے چچا شیخ الحدیث تھے۔ امام مالک نے جب حدیث و فقہ
میں کمال پیدا کیا تو یہ عارضی اوصاف ان کی ذاتی قابلیت پر طرّہ بن کر نمایاں ہوگئے
اور تمام اطراف و دیار میں ان کی شہرت کا سکہ جم گیا۔ امام شافعی کو اور بھی خصوصیتیں
حاصل تھیں۔ مکہ معظمہ وطن تھا۔ باپ کی طرف سے قریشی اور مطلبی ماں کی طرف سے ہاشمی
تھے۔ ان کا تمام خاندان ہمیشہ سے معزز و ممتاز چلا آتا تھا ان کے پردادا سائب جنگ
بدر میں ہاشمیوں کے علمبردار تھے اور گرفتار ہو کر ایمان لائے تھے۔ مکہ معظمہ کی ولادت،
خاندان کا اعزاز، رسول اللہ ﷺ کی ہم نسبی ایسی چیزیں تھیں جن سے بڑھ کر حسنِ قبول اور
مرجعیت کے لئے کوئی کارگر آلہ نہیں ہو سکتا تھا۔ امام ابوحنیفہ میں اس قسم کی کوئی خصوصیت
نہ تھی۔ قریشی اور ہاشمی ہونا تو ایک طرف وہ عربی النسل بھی نہ تھے۔ خاندان میں کوئی ایسا
شخص نہیں گزرا تھا جو اسلامی کا گروہ کا مرجع اور مقتدا ہوتا۔ آبائی پیشہ تجارت
تھا اور خود بھی تمام عمر اسی ذریعہ سے زندگی بسر کی۔ کوفہ جو ان کا مقام ولادت
تھا گو دارالعلوم تھا۔ لیکن مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کا ہمسر کیونکر ہو سکتا تھا بعض
اتفاقی اور ناگزیر اسباب سے ارباب روایت کا ایک گروہ ان کی مخالفت پر کمربستہ تھا۔
غرض حسنِ قبول اور عام اثر کے لئے جو اسباب درکار ہیں وہ بالکل نہ تھے۔ باوجود اس
کے ان کی فقہ کا تمام ممالک اسلامیہ میں اس وسعت اور ترقی کے ساتھ رواج
پانا یقیناً اس بات کی دلیل ہے کہ ان کا طریقۂ فقہ انسانی ضرورتوں کے نہایت مناسب
اور موزوں واقع ہوا تھا اور بالخصوص تمدّن کے ساتھ جس قدر ان کی فقہ کو مناسبت
تھی کسی فقہ کو نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اور ائمہ کے مذہب کو زیادہ انہیں ملکوں میں
رواج ہوا جہاں تہذیب و تمدّن نے زیادہ ترقی کی تھی۔ علامہ ابن خلدون اس بات
کی وجہ بتاتے ہیں کہ مغرب اندلس میں بدویت غالب تھی اور وہاں کے لوگوں
نے وہ ترقی نہیں حاصل کی جو اہل عراق نے حاصل کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے
ممالک میں امام مالک کی فقہ کے سوا اور کسی فقہ کو فروغ نہ ہو سکا۔
حنفی فقہ جس میں امام ابوحنیفہ کے علاوہ ان کے نام اور شاگردوں کے

مسائل بھی شامل ہیں اُس زمانہ کا بہت بڑا قانون بلکہ بہت بڑا مجموعہ قوانین تھا۔ زمانہ مابعد میں گو علمائے حنفیہ نے اس پر بہت کچھ اضافہ کیا اور جزئیات کی تفریع کے ساتھ اصول فن کو نہایت ترقی دی لیکن ایجاز کے زمانہ میں جس قدر کسی فن کی تکمیل ہو سکتی ہے وہ اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی جو امام ابوحنیفہؒ کے عہد میں فقہ کو حاصل ہو چکی تھی اس مجموعہ میں عبادت کے علاوہ دیوانی، فوجداری، تعزیرات، لگان، مالگزاری، شہادت، معاہدہ، وراثت، وصیت اور بہت سے قوانین شامل تھے۔ اس کی وسعت اور خوبی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ہارون الرشید اعظم کی وسیع سلطنت جو سندھ سے ایشیائے کوچک تک پھیلی ہوئی تھی انھیں اصول پر قائم تھی اور اس عہد کے تمام واقعات اور معاملات انھیں قواعد کی بنا پر فیصل ہوتے تھے۔ یہ قانون جس کو فقہ کہتے ہیں دو قسم کے مسائل پر مشتمل ہے اور اس لحاظ سے اس کے واضع کی دو مختلف حیثیتیں ہیں۔

مسائل فقہ کی تقسیم

(۱) وہ مسائل جو شریعت سے ماخوذ ہیں اور تشریعی احکام کہے جاتے ہیں۔

(۲) وہ احکام جن سے شریعت نے سکوت کیا ہے اور جو تمدن و معاشرت کی ضرورتوں سے پیدا ہوتے ہیں اور جن کا ذکر شریعت میں ہے لیکن تشریعی طور پر نہیں۔

پہلی قسم کے مسائل کے لحاظ سے فقیہ کی حیثیت شارح اور مفسر کی حیثیت سے اور اس اعتبار سے اس کے لئے جس قسم کی قابلیت درکار ہے وہ مہارت زبان، واقفیت نصوص، قوت استنباط، توفیق متعارضات، ترجیح دلائل ہے۔ دوسری قسم کے لحاظ سے واضع فقہ ایک مقنن کی حیثیت رکھتا ہے اور اس لحاظ سے اس کی قابلیت اس رتبہ کی ہونی چاہیئے جیسی کہ دنیا کے اور مشہور مقننوں کی تھی۔ یہ دونوں حیثیتیں ایک دوسرے سے ممتاز ہیں۔ اسلام میں بہت سے نامور گزرے ہیں جو مقنن اور واضع قانون تھے لیکن نصوص شرعی کے مفسر نہیں کہے جا سکتے تھے۔ جہاں تک ہماری واقفیت ہے اسلام کے ابتدائی وسیع دور میں قدرت نے یہ دونوں قابلیتیں جس اعلیٰ درجہ پر امام ابوحنیفہؒ میں جمع کر دی تھیں کسی مجتہد یا امام میں جمع نہیں

تشریعی اور غیر تشریعی احادیث کا فرق

ہوئیں۔ علمِ فقہ کے متعلق سب سے بڑا کام جو امام صاحب نے کیا وہ تشریعی اور غیر تشریعی احکام میں امتیاز قائم کرنا تھا۔

شارع علیہ السلام کے اقوال و افعال جو سلسلۂ روایت سے منضبط کر گئے ان میں بہت سے ایسے ہوتے تھے جن کو منصب رسالت سے کچھ تعلق نہ تھا لیکن بطور ایک اصطلاح کے ان سب پر حدیث کا لفظ اطلاق کیا جاتا تھا۔ فقہ کی توضیح میں ایک عام اور سخت غلطی یہ ہوئی کہ لوگوں نے ان تمام امور کو شرعی حیثیت پر محمول کیا اور اس خیال سے ان پر مسائل اور احکام کی بنیاد قائم کی، حالانکہ وہ حدیثیں منصب شریعت سے علاقہ نہیں رکھتی تھیں۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ آنحضرتؐ سے جو کچھ روایت کیا گیا ہے اور کتب حدیث میں اس کی تدوین ہوئی اس کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) جو تبلیغ رسالت سے کچھ تعلق رکھتا ہے۔ اور اسی بارہ میں یہ آیت اتری ہے مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (یعنی پیغمبر جو چیز تم کو دے اس کو اختیار کرو اور جس چیز سے روکے اس سے باز آؤ۔

(۲) جو تبلیغ رسالت سے متعلق نہیں۔ چنانچہ ان کی نسبت آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا ہے اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ اِذَا اَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِّنْ دِيْنِكُمْ فَخُذُوْهُ وَاِذَا اَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِّنْ رَّاْيِيْ فَاِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ۔ یعنی میں ایک آدمی ہوں جب میں کوئی مذہبی حکم دوں تو تم لوگ اس کے پابند ہو جاؤ اور جب میں اپنی رائے سے کسی بات کا حکم دوں تو میں صرف ایک آدمی ہوں۔

اس دوسری قسم میں وہ حدیثیں ہیں جو آنحضرتؐ نے طب کے متعلق ارشاد کیں۔ اور اسی قسم میں وہ افعال داخل ہیں جو آنحضرتؐ سے عادتاً صادر ہوئے نہ عبادۃً اور اتفاقاً واقع ہوئے نہ قصداً۔ اور اسی قسم میں وہ حدیثیں داخل ہیں جو آنحضرتؐ نے اپنی قوم کے گمان کے موافق بیان کیں۔ مثلاً ام زرع کی حدیث اور خرافہ کی حدیث اور اسی قسم میں وہ امور داخل ہیں جو آنحضرتؐ نے اس

وقت مصلحت جزئی کے موافق اختیار فرمائے اور وہ سب لوگوں پر واجب العمل نہیں ہیں. مثلاً فوجوں کی تیاری شعار کی تعیین ۔ اسی بنا پر حضرت عمر نے فرمایا تھا کہ اب رمل کرنے کی ضرورت کیا ہے۔ جس قوم کے دکھانے کے لیے ہم رمل کرتے تھے ان کو خدا نے ہلاک کر دیا اور آنحضرت ؐ کے بہت سے اسی قسم میں داخل ہیں۔ مثلاً یہ حکم کہ جہاد میں جو شخص کسی کافر کو قتل کرے تو اس کے ہتھیار کا مالک وہی ہوگا ۔

شاہ ولی اللہ صاحب ؒ نے حدیث کی قسموں میں جو دقیق فرق بیان کیا ہے یہ وہی نکتہ ہے جس کی طرف سب سے پہلے امام ابو حنیفہ ؒ کا ذہن منتقل ہوا۔ اسی بنا پر بہت سے مسائل مثلاً جمعہ، خروج النساء الی العیدین، نفاذ طلاق، تعین جزیہ، تشخیص خراج، تقسیم غنائم وغیرہ میں جو حدیثیں وارد ہیں ان کو امام ابو حنیفہ نے دوسری قسم میں داخل کیا ہے لیکن امام شافعی وغیرہ ان حدیثوں کو بھی تشریعی حدیثیں سمجھتے ہیں۔

حنفی فقہ کو بمقابلہ اور فقہوں کے بہت بڑی خصوصیت جو حاصل ہے وہ یہی ہے کہ اس کے مسائل عموماً اسی قاعدہ پر مبنی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس میں وہ وسعت اور آزادی آزادی پائی جاتی ہے جو اور ائمہ کے مسائل میں نہیں پائی جاتی یہ قاعدہ اگرچہ نہایت صاف اور صریح ہے لیکن افسوس ہے کہ اور ائمہ نے اس پر لحاظ نہیں کیا۔ اور اگر خلفائے راشدین کی نظیریں موجود نہ ہوتیں تو شاید امام ابو حنیفہ کو بھی اس کے اختیار کرنے جرأت نہ ہوتی۔ اگرچہ امام صاحب کے بعد بھی بعض ائمہ نے جن کو ان کے مقابلہ میں اجتہاد کا دعویٰ تھا اس عمدہ اصول کی پیروی نہ کی اور اسی غلط خیال پر قائم رہے لیکن اس میں کون شبہہ کر سکتا ہے کہ امام صاحب کی رائے نہایت صحیح اور دقیقہ سنجی پر مبنی ہے۔

خلفائے راشدین سے بڑھ کر کون احکام شریعت کا نکتہ شناس ہو سکتا ہے انھوں نے کیا کیا؟ حضرت عمرؓ کے آغاز خلافت تک امہات اولاد یعنی وہ لونڈیاں جن سے اولاد ہو چکی ہو عموماً خرید کی بیچی جاتی تھیں ۔حضرت عمرؓ نے اس رواج کو روک دیا۔ آنحضرت نے تبوک کے سفر میں غیر مذہب والوں پر جو جزیہ مقرر کیا وہ کس ایک دینار تھا۔ حضرت عمرؓ نے ایران میں ۴۸، ۱۲، ۶ کے حساب سے شرطیں مقرر کیں آنحضرت

مال غنیمت جب تقسیم کرتے تھے اپنے عزیز و اقارب کا بھی حصہ لگاتے تھے خلفائے راشدین میں سے کسی نے حتیٰ کہ حضرت علیؓ نے بھی ہاشمیوں کا حصہ نہ دیا آنحضرت کے زمانہ میں بلکہ حضرت ابوبکرؓ کے عہد تک تینوں طلاقیں ایک سمجھی جاتی تھیں حضرت عمرؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں منادی کرا دی کہ تین طلاقیں طلاق بائن سمجھی جائے گی۔ آنحضرتؐ کے عہد میں شراب پینے کی سزا میں کوئی خاص حد نہیں مقرر ہوئی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس کی چالیس دُرّے قرار دیئے۔ اور حضرت عمرؓ نے بسبب اس کے کہ اُن کے زمانہ میں مے نوشی کا زیادہ رواج ہو چلا تھا چالیس سے اسّی دُرّے کر دیے یہ وہ واقعات ہیں جو حدیث کی کتابوں میں مذکور ہیں اور جن کے ثبوت سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا۔ لیکن کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ راشدین کسی حکم کو آنحضرت کا تشریعی حکم سمجھ کر اس کی مخالفت کرتے تھے۔ اگر نعوذ باللہ ایسا کرتے تھے تو خلفائے راشدین نہ تھے بلکہ عیاذاً باللہ رسول اللہؐ کے حریف اور خائن تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ صحابہ جو رات دن آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر رہتے تھے اور فیض صحبت کی وجہ سے شریعت کے ادا شناس ہو گئے تھے اُن کو یہ تمیز کرنا نہایت آسان کام تھا کہ کون سے احکام تشریعی رکھتے ہیں اور کون سے اس حد میں داخل ہیں جنکی نسبت آنحضرتؐ نے فرمایا کہ انتم اعلم بامور دنیاکم۔ حضرت عائشہؓ آنحضرتؐ کی وفات کے بعد ایک موقع پر کہا کہ "آج اگر رسول اللہؐ موجود ہوتے تو عورتوں کو مسجد میں جانے کی اجازت نہ دیتے" یہ صریح اس بات کی شہادت ہے کہ حضرت عائشہؓ نے رسول اللہؐ کی اس اجازت کو تشریعی اور لازمی نہیں قرار دیا ورنہ زمانہ اور حالات کے اختلاف سے اسپر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔

امام ابوحنیفہ نے اس مرحلہ میں صحابہ ہی کو دلیل راہ بنایا اور اس قسم کے مسائل میں ان کی رائے عموماً خلفائے راشدین کے طرزِ عمل کے موافق ہے۔ لیکن جن لوگوں کی نگاہیں اس بحث تک نہیں پہنچیں وہ امام ابوحنیفہ بلکہ صحابہ کو بھی مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔ طلاق کے مسئلہ میں قاضی شوکانی نے حضرت عمرؓ کا قول نقل کر کے لکھا ہے کہ

"رسول اللہ ؐ کے مقابلہ میں بیچارے عمر رضؓ کی کیا حقیقت ہے" لیکن قاضی شوکانی یہ نہ سمجھے کہ حضرت عمر رضؓ قاضی صاحب سے زیادہ اسبات کو سمجھتے تھے کہ رسول اللہ ؐ کے مقابلے میں ان کی کوئی حقیقت نہیں۔

فقہ کی پہلی قسم کے متعلق امام ابو حنیفہ رح نے جو بڑا کام کیا وہ قواعد استنباط کا انضباط تھا جسکی وجہ سے مصر د جو ابتک جزئیات مسائل کا نام تھا) ایک مستقل فن بن گیا۔ امام ابو حنیفہ کی علمی تاریخ میں جو چیز سب سے زیادہ قابل قدر اور تعجب انگیز ہے وہ ان قواعد کی تجدید انضباط ہے۔ ایسے زمانہ میں جبکہ علوم نہایت ابتدائی حالت میں تھے یہانتک کہ نقل و کتابت کا بھی رواج نہ تھا ایسے دقیق فن کی بنیاد ڈالنی درحقیقت امام ابو حنیفہ ہی کا کام تھا۔

عام خیال یہ ہے کہ قواعد جن کو اب اصول فقہ سے تعبیر کیا جاتا ہے سب سے پہلے امام شافعی رح نے مرتب کئے۔ یہ دعویٰ اس لحاظ سے تو صحیح ہے کہ امام شافعی سے پہلے یہ مسائل مستقل طور سے جزو تحریر میں نہیں آئے تھے لیکن اصل فن کی بنیاد امام شافعی سے بہت پہلے پڑ چکی تھی اور اگر تحریر کی قید اٹھا دی جائے تو امام ابو حنیفہ اس کے موجد کہے جا سکتے ہیں ۔

اصل یہ ہے کہ مسائل کا استنباط اور احکام کی تفریع تابعین بلکہ صحابہ ہی کے زمانہ میں شروع ہو چکی تھی لیکن استنباط اور استخراج کا جو طریقہ تھا وہ کوئی علمی صورت نہیں رکھتا تھا جسطرح عام لوگ کسی عبارت سے کسی نتیجہ کا استنباط یا اور کسی حکم کی تفریع صرف وجدانی مذاق کی رو سے کرتے ہیں اور نہیں جانتے کہ ان کا استنباط یا تفریع کسی قاعدہ کلیہ کے تحت میں داخل ہے اور اسکے کیا شرائط اور کیا قیود ہیں اسی طرح فقہی مسائل بھی استنباط کئے جاتے تھے نہ علمی اصطلاحیں قائم ہوئی تھیں نہ کچھ اصول منضبط ہوئے تھے۔

بنی امیہ کے اخیر دور میں کچھ کچھ اصطلاحیں پیدا ہوئیں۔ چنانچہ واصل بن عطاء نے جو علم کلام کا موجد تھا احکام شرعیہ کی تقسیم کی اور کہا کہ حق کے ثبوت کے چار طریقے ہیں۔ قرآن ناطق۔ حدیث متفق علیہ۔ اجماع امت۔ عقل و حجت (یعنی قیاس)۔ واصل نے اور بھی چند مسائل اور اصطلاحیں قائم کیں مثلاً یہ کہ عموم و خصوص وعد و ... نسخ صرف امر و نواہی میں ہو سکتا ہے اخبار و واقعات میں نسخ کے احتمال نہیں

ان مسائل کو ہلال عسکری نے کتاب الاوائل میں واصل بن عطا کی طرف منسوب کیا ہے ۲

ان مسائل کے لحاظ سے اصول فقہ میں اولیت کا فخر واضع کی طرف منسوب کیا جاتا ہے
لیکن یہ اسی قسم کی اولیت ہوگی جس طرح نحو کے دو تین قاعدوں کے بیان کرنے سے کہا جاتا ہے
کہ حضرت علی علیہ السلام فن نحو کے موجد ہیں۔ بہرحال امام ابوحنیفہ کے زمانہ تک جو کچھ ہوا تھا۔
اس سے زیادہ نہیں ہوا تھا لیکن چونکہ امام صاحب نے فقہ کو مجتہدانہ اور مستقل فن کی حیثیت سے ترتیب دینا چاہا
اسلئے استنباط اور استخراج کے مسائل قرار دینے پڑے۔ اگرچہ زمانہ مابعد میں اصول فقہ ایک
نہایت وسیع فن بن گیا اور سینکڑوں مسائل ایسے ایجاد ہو گئے جن کا امام ابوحنیفہ کے زمانہ
میں اثر بھی نہ تھا لیکن کچھ شبہہ نہیں کہ اس فن کے امہات مسائل جن پر فن حدیث کی بنیاد
قائم ہے امام صاحب کے ہی کے زمانہ میں منضبط ہو چکے تھے۔ اصول اربعہ کی توضیح، احادیث
کے مراتب اور ان کے احکام، جرح و تعدیل کے اصول، اجماع کے حدود و ضوابط، قیاس
کے احکام و شرائط، احکام کی انواع، عموم و خصوص کی تحدید، دفع تعارض کے قواعد، فہم
مراد کے طرق، یہ مسائل ہیں جو اصول فقہ کے ارکان ہیں۔ ان تمام مسائل کے متعلق امام
صاحب نے جو اصول قرار دیے ان کو ہم بحث میں لکھ آئے ہیں انکے علاوہ ابواب کے متعلق امام
صاحب نے تمام ضروری اصول منضبط کر دیے تھے مثلاً ما لم یثبت بالتواتر لیس بقرآن۔
الزیادۃ نسخ۔ لا یجوز الزیادۃ علی الکتاب بخبر الواحد حمل المطلق علی
المقید زیادۃ علی النص۔ عموم القرآن لا یتخصص بالاحاد العلم قطعی
کالخاص للخاص ان کان متاخراً خصص العام وان کان متقدماً فلا
بل کان العام ناسخاً للخاص۔ ان کان جھل التاریخ تساقطا و یطلب دلیل
آخر مفہوم الصفۃ لا یحتج بالنہی لا تدل علی البطلان۔ امام صاحب کے یہ
اقوال ان کے شاگردوں کی تصنیفات یا اصول کی کتابوں میں جو شافعیہ و حنفیہ وغیرہ نے
لکھے ہیں جستہ جستہ مذکور ہیں جن کو اگر ایک جگہ جمع کر دیا جائے تو ایک مختصر رسالہ تیار ہو سکتا
ہے[۱]۔ یہی اصول ہیں جن کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہ ایک خاص طریقہ اجتہاد

---

[۱] لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اصول فقہ کی کتابوں میں جو بہت سے اصول مذکور ہیں ان سب کی نسبت یہ دعوٰی نہیں کیا
جا سکتا کہ وہ امام ابوحنیفہ کے اقوال ہیں۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں اس پر ایک نہایت عمدہ تقریر
لکھی ہے لیکن شاہ صاحب نے بعض ان اقوال سے بھی انکار کیا ہے جو بروایت صحیحہ امام صاحب سے ثابت ہیں ۱۲

کے بانی ہیں۔ انھیں اصول کے اتحاد کی بنا پر امام محمد و قاضی ابویوسف کا طریقہ امام صاحب کے طریقے سے الگ نہیں سمجھا جاتا۔ حالانکہ جزئیات مسائل میں ان لوگوں نے سینکڑوں ہزاروں جگہ ان سے اختلاف کیا ہے۔

ان اصولی مسائل پر جو جا سکے کہ امام شافعی وغیرہ نے اُن سے اختلاف کیا ہے نہایت وسیع اور دقیق بحثیں قائم ہو گئی ہیں۔ افسوس ہے کہ ہماری مختلف تالیف میں انکی گنجائش نہیں۔ اصول کی کتابوں میں یہ مباحث نہایت تفصیل سے مذکور ہیں۔ جس شخص کا جی چاہے ان کتابوں کی طرف رجوع کر سکتا ہے۔

جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں فقہ کے اس حصہ میں امام صاحب کی حیثیت ایک مفسر اور مستنبط کی حیثیت ہے اور کچھ شبہ نہیں کہ اس باب میں امام صاحب نے جو کام کیا وہ نہ صرف تاریخ اسلام میں بلکہ کُل دنیا کی تاریخ میں بے نظیر ہے۔ دنیا میں اور بھی قومیں ہیں جن کے پاس آسمانی کتابیں ہیں اور وہ لوگ ان کتابوں سے اخذ احکام کرتے ہیں۔ لیکن کوئی قوم یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ اس نے استنباط مسائل کے اصول اور قواعد منضبط کئے اور اس کو ایک مستقل فن کے مرتبہ تک پہنچا دیا۔

فقہ کا دوسرا حصہ جو صرف قانون کی حیثیت رکھتا ہے پہلے حصہ کی نسبت زیادہ وسیع ہے اور یہ وہ خاص حصہ ہے جس میں امام ابوحنیفہ علانیہ تمام مجتہدین سے ممتاز ہیں بلکہ سچ ہے کہ اگر اسلام میں کوئی شخص واضع قانون گذرا ہے تو وہ صرف امام ابوحنیفہؒ ہیں۔

مسلمانوں میں توضیع قانون کا کام ہمیشہ ان لوگوں کے ہاتھ میں رہا جو مذہبی پیشوا تھے اور زہد و اتقا میں غلو رکھتے تھے۔ مذہبی لوگوں میں جو اوصاف نہایت قابل سمجھے جاتے ہیں وہ یہ ہیں دنیاوی امور سے علیحدگی کم آمیزی، معاملات میں سختی، عام واقعات سے بے خبری، بخبر یا سبب دانوں سے تنفر۔ یہ تمام اوصاف وہ ہیں جو تمدن کے مخالف ہیں اور جس شخص میں یہ اوصاف اعتدال سے بڑھ کر اور فطری ہوں وہ مشکل سے تمدن کی ضروریات کا اندازہ داں ہو سکتا ہے۔ تقدس و پاکیزہ نفسی کے لحاظ سے ان لوگوں کی

جسقدر عظمت کی جائے کم ہے۔ لیکن دنیا اور دنیا والوں کا کام ان سے حل نہیں ہو سکتا۔ حضرت جنید بغدادیؒ معروف کرخیؒ۔ شیخ شبلیؒ، داؤد طائی کی عظمت وشان سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ یہ لوگ واضع قانون نہیں ہو سکتے تھے"

مجتہدین جنھوں نے فقہ کے نام سے ملکی اور شخصی قانون بنائے اگرچہ رہبانیت کے زور سے دُور رہتے تاہم یہ کہنا مشکل ہے کہ تمدن کے وسیع تعلقات پر انکی نگاہ پڑ سکتی تھی جن سے ان کو عمر بھر کبھی سروکار نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے قوانین میں بعض جگہ ایسی سختی اور تنگی پائی جاتی ہے جس پر مشکل سے عملدرآمد ہو سکتا ہے۔ امام شافعی وغیرہ کا مذہب ہے کہ نکاح میں بجز ثقات کے کوئی شخص گواہ نہیں ہو سکتا۔ ہمسایہ کو حق شفعہ نہیں پہنچتا۔ بیع بالمعاملات جائز نہیں۔ ذمیوں کی شہادت کسی حال میں مقبول نہیں۔ ایک مسلمان سینکڑوں ذمیوں کو بے قصور قتل کر ڈالے تاہم وہ قصاص میں پکڑا نہیں جا سکتا ان مسائل سے دنیا کا کام کیونکر چل سکتا ہے۔

امام ابوحنیفہ اس وصف میں اپنے تمام معصروں سے ممتاز تھے کہ وہ مذہبی تقدس کے ساتھ دنیاوی اغراض کے انداز شناس تھے اور تمدن کی ضرورتوں کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ مراجعت اور فصل قضایا کی وجہ سے ہزاروں پیچیدہ معاملات انکی نگاہ سے گزر چکے تھے۔ ان کی مجلس افتار بہت بڑی عدالت عالیہ تھی، جس نے لاکھوں مقدما کا فیصلہ کیا تھا، وہ ملکی حیثیت رکھتی تھی اور اراکان سلطنت مہمات امور میں ان سے مشورہ لیتے تھے۔ ان کے شاگرد اور ہم نشین جن کی تعداد سینکڑوں سے زیادہ تھی عموماً وہ لوگ تھے جو منصب قضا پر مامور تھے۔

ان باتوں کے ساتھ خود ان کی طبیعت مقننانہ اور معاملہ سنج واقع ہوئی تھی اور ہر بات کو قانونی حیثیت سے دیکھتے اور اس کے دقیق نکتوں تک پہنچتے تھے۔ اس بات کا اندازہ واقعہ ذیل سے ہو سکتا ہے جس کا ذکر اکثر مورخین نے کیا ہے۔

ایک دن امام صاحب قاضی ابی لیلیٰ سے ملنے گئے۔ اس وقت ان کے سامنے ایک مقدمہ پیش تھا۔ مدعی کا بیان تھا کہ فلاں شخص نے میری ماں کو زانیہ کہا ہے

اس لئے از الہ حیثیت عرفی کا دعویدار ہوں۔ قاضی صاحب نے مدعا علیہ کی طرف جو اس موقع پر موجود تھا خطاب کیا کہ تم کیا جواب دیتے ہو؟ امام ابو حنیفہ نے قاضی صاحب سے کہا ابھی مقدمہ قائم نہیں ہوا۔ مدعی کا اظہار لینا چاہیئے کہ اسکی ماں زندہ ہے یا نہیں۔ کیونکہ اس کو بھی شریک مقدمہ ہونا چاہیئے۔ اگر اس نے اس کی معرفت مقدمہ دائر کیا ہے تو اس کو مختار نامہ پیش کرنا چاہیئے۔ قاضی صاحب نے مدعی کا اظہار لیا۔ معلوم ہوا اس کی ماں مر چکی ہے۔ اس پر قاضی صاحب نے مقدمہ آگے چلانا چاہا۔ امام صاحب نے کہا مدعی سے پوچھنا چاہیئے کہ اس کے بھائی بہن ہیں یا نہیں؟ کیونکہ اگر دعویدار موجود ہیں تو ان کو بھی شریک مقدمہ ہونا چاہیئے۔ اسی طرح امام صاحب نے اور چند سوالات کئے۔ جب وہ مراتب طے ہو چکے تو فرمایا کہ اب مقدمہ قائم ہوا اور آپ مدعا علیہ کا اظہار لیجئے۔

اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ قاضی صاحب نے جس طریقہ سے مقدمہ کی کاروائی شروع کی تھی وہ اس حیثیت سے بیہودہ کرنا تھا جس طرح عوام آپس میں فصل خصومات کیا کرتے ہیں۔ لیکن امام صاحب با قاعدہ فیصلہ چاہتے تھے جس کا ضروری اصول یہ ہے کہ ایک حق سے جتنے لوگ دعویدار ہو سکتے ہیں ان سب کو مقدمہ میں شریک ہونا چاہیئے تاکہ عدالت کو ایک ہی حق کے فیصلہ کرنے میں بار بار زحمت نہ اٹھانی پڑے۔ امام صاحب نے مقدمہ کے اس دوسرے حصّہ کی جسطرح تدوین کی اور جس ضبط و ربط سے اس کی جزئیات کا استقصار کیا وہ اس زمانہ کا نہایت وسیع قانون تھا۔ اگرچہ اس کی تعبیر ایک عام لفظ (فقہ) سے کیجاتی ہے لیکن درحقیقت اسمیں بہت سے قوانین شامل تھے۔ چنانچہ آج تعلیم یافتہ دنیا میں انھیں ابواب کے مسائل جو ترتیب دیے گئے وہ جدا جدا قانون کے نام سے موسوم ہیں۔ مثلاً قانون معاہدہ، قانون بیع، قانون لگان و مالگزاری، تعزیرات ضابطہ فوجداری وغیرہ وغیرہ۔ اسی بنا پر بعض یورپین مصنفوں کا خیال[1] ہے کہ امام ابو حنیفہ نے فقہ کی تدوین میں رومن لا یعنی رومیوں کے قانون سے بہت

---

[1] ہم نے اس خیال کو شہرت عام کی بنا پر لکھا تھا۔ لیکن تالیف کتاب کے بعد ہم کو معلوم ہوا مسٹر شیلڈن امیوز نے جو آجکل لنڈن یونیورسٹی کے لا پروفیسر ہیں اپنی کتاب رومن سول میں اس دعوی کو بڑے شور سے ثابت کرنا چاہا ہے اور اس پر ایک مفصل بحث کی ہے[1]۔ یورپ کو جو برتری آجکل تمام قوموں میں بالخصوص مسلمانوں پر حاصل اس نے یورپین مصنفوں کے دل میں بالطبع یہ بات پیدا کر دی ہے کہ وہ مسلمانوں کے گزشتہ کارناموں کو تحقیر کی نگاہ سے

[1] دیکھو کتاب مذکور صفحہ ۴۰۶ لغایت ۴۱۵۔

کچھ ردوبدل اور اسکے بہت سے مسائل اپنے فقہ میں داخل کر لئے۔ اس خیال کی تائید میں یہ قرائن پیش کئے جاتے ہیں۔ (۱) حنفی فقہ کے بہت سے مسائل رومن لا کے مطابق ہیں (۲) رومن لا تمام ممالک شام جاری تھا اور چونکہ مسلمانوں پر شام کی معاشرت و تمدن کا بہت کچھ اثر پڑا ہوا تھا اسلئے قیاس غالب یہ ہے کہ علمائے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۵) دیکھیں اور اگر کوئی کمال ایسا ہی اور نمایاں ہو جس سے کسی طرح انکار نہ ہو سکے تو یہ دعویٰ کریں کہ وہ مسلمانوں کی ایجاد نہیں ہے بلکہ روم و یونان و مصر وغیرہ سے ماخوذ ہے۔ یہی اثر ہے جس نے مسٹر شیلڈن ایموز کو اس بحث پر مجبور کیا۔ انھوں نے اپنے دعوے کو فقہ حنفی تک محدود نہیں رکھا بلکہ عام قانون اسلام کی نسبت ان کا یہ دعویٰ ہے۔ ہم ان کے مضمون کو قریباً ان کے الفاظ میں نقل کرتے ہیں۔ اور دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ اپنے دعوے میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں۔ وہ اپنے مضمون کو اس تمہید سے شروع کرتے ہیں "یہ مشرق میں دفعۃً ایک بالکل جدید طرز کا قائم بالذات سلسلہ قانون کا پیدا ہو جانا جس کی نسبت دعویٰ کیا گیا ہے کہ وہ قرآن و حدیث پر مبنی ہے ایک ایسی عجیب بات ہے کہ خواہ مخواہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شریعت اسلامی کی نسبت جو دعویٰ کیا جاتا ہے اس کی تاریخی بنیاد کیا ہے۔ علاوہ دوسری شہادتوں کے مورخانہ قیاس اس دعوے کے سخت مخالف ہے۔ اس کے بعد پروفیسر مذکور اس کا یہ ثبوت کرتے ہیں ہمیشہ سے یہ دستور چلا آتا ہے کہ ہر سلسلہ قانونی کو کسی واقعی یا فرضی واضع قانون کے نام سے موسوم کر دیا کرتے ہیں۔ پھر فرماتے ہیں کہ اس لحاظ سے ابتدا ہی میں ایک قوی قیاس پیدا ہوتا ہے کہ جو ترتیب اور مضبوط سلسلہ قانون فاتحوں نے تمام ممالک مفتوحہ میں جاری کیا وہ بہ تبدیل ہیئت کوئی اعلیٰ درجہ کا مکمل رواج یافتہ سلسلہ قانون تھا۔" پروفیسر موصوف نے تاریخی شہادتوں سے ثابت کیا ہے کہ جس وقت مسلمانوں نے شام و مصر کو فتح کیا تو وہاں رومی قوانین کے متعدد مدرسے موجود تھے۔ بیروت میں الگزنڈر سیویرس کے زمانہ سے ایک مدرسہ قانون چلا آتا تھا جس میں چار پروفیسر تھے۔ قیصریہ میں وکلا کی ایک جماعت رہتی تھی اسکندریہ میں قانون کی تعلیم جاری تھی۔ ان واقعات کی تفصیل کے بعد پروفیسر موصوف فرماتے ہیں کہ اس قیاس کی نسبت کہ اسلامی قانون پر رومی قانون کا اثر پڑا ہے اس قدر کہنا کافی ہوگا۔ لیکن جس طریقہ سے کہ اسلامی فتوحات ہوئیں اور جسطرح پر مسلمان ممالک مفتوحہ میں آباد ہوئے اگر ان امور پر غور کیا جائے تو یہ قیاس یقین سے بدل جاتا ہے "اسلامی فتوحات کے طریقے سے پروفیسر موصوف نے اسطرح استدلال کیا ہے کہ شروع میں مسلمانوں نے غیر قوموں سے بجز جزیہ وصول کرنے کے اور کسی قسم کا اثر ڈالنا نہیں چاہا لیکن جب ملکی ترقی کا زمانہ آیا تو انھوں نے غیر قوموں کے لئے قانون وضع کئے جو خود انھیں قوموں سے ماخوذ تھے۔ پروفیسر موصوف کے الفاظ یہ ہیں "نہ تو قرآن اور نہ ابتدائی خلافت کے زمانہ میں اس بات کی کوشش ہوئی کہ جو اعلیٰ قومیں عرب کے ماتحت ہو گئیں تھیں ان کی دنیوی زندگی کے پیچیدہ معاملات میں دست اندازی کی جائے کہ اس کے لئے فرصت نہ تھی نہ شوق تھا نہ ایسے آدمی موجود تھے جو اس خدمت کو انجام دے سکتے۔ جب بغداد اور اندلس کے شہروں اور قاہرہ میں امن و امان کا زمانہ آیا اور مطالعہ و غور کا موقع ملا تو طب و ریاضی و منطق و علوم نفسیہ میں ترقی ہوئی جسطرح کہ عربوں نے ارسطو سے منطق سیکھی۔ اسی طرح بلبل۔ ملبور اور ان کے یونانی شارحوں سے علم قانون اخذ کیا۔ اسکے بعد پروفیسر صاحب موصوف اس خیال کی قطعیت پر دلیل قائم کرتے ہیں کہ قرآن میں اس قدر

اسلام نے قانونی مسائل میں بھی اُن سے استفادہ حاصل کیا (۳) اس قدر متعدد اور وسیع قوانین جو فقہ میں شامل ہیں ان کی توجیہ بغیر اس کے نہیں ہو سکتی کہ دنیا کے اور قوانین سے مدد لی گئی ہو۔ اس بحث کا اصل تصفیہ تو جب ہو سکتا ہے کہ رومن لا اور حنفی فقہ کا نہایت دقت

(بسلسلہ حاشیہ صفحہ ۱۶۵) احکام ہیں کہ ان پر ایک قانون کی بنیاد نہیں قائم ہو سکتی ۔ پروفیسر صاحب موصوف فرماتے ہیں کہ قرآن میں صرف یہ احکام ہیں۔ خدا کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بناؤ، تم اپنی بیویوں کو دو دفعہ طلاق دے سکتے ہو پھر ان کو رحم دلی یا مہربانی سے علیحدہ کر دو۔ سود خوار قیامت میں آسیب زدوں کی طرح اٹھیں گے ۔ میعادی قرض کو قلم بند کر لیا کرو۔ اگر بیویوں کے ساتھ انصاف کر سکتے ہو۔ لیکن چار سے زیادہ نہیں۔ مرد کو دو حصہ ملے گا اور عورتوں کو ایک ۔ لیکن پروفیسر صاحب کو صرف شوہر کا حصہ اور یہ کہ مرد کا عورت کے دو حصے کے برابر ملنا ہے معلوم ہے ۔ افسوس ان کو یہ معلوم نہیں کہ وراثت کا پورا باب اجمالاً قرآن میں مذکور ہے اور خصوصاً والدین کا حصہ اور کلالہ کے احکام تو صاف صاف صریحاً مذکور ہیں ۔ قصاص اور دیت کے مسائل جو نہایت تفصیل سے قرآن میں مذکور ہیں اور جن میں قتل عمد اور قتل خطاء اور ان کے احکام کی پوری تفصیل ۔ ہے پروفیسر صاحب کو سرے سے معلوم نہیں حیرت ہے کہ اس محدود واقفیت کے ساتھ پروفیسر صاحب نے اس بحث کے طے کرنے کی کیونکر جرأت کی۔

یہ تو ضمنی بحث تھی اب ہم ان مقدمات پر توجہ کرتے ہیں جن پر پروفیسر صاحب کے استدلال کی بنا ہے۔ مقدمہ انھوں نے خود تسلیم کر لیا ہے اور واقع میں بھی صحیح ہے کہ شروع اسلام یعنی خلافت راشدہ کے اخیر زمانہ تک مسلمان غیر قوموں سے بالکل الگ رہے اور ان کے قانون احکام سے کسی قسم کی واقفیت نہیں حاصل کی، اس لئے دمشق و بیروت واسکندریہ میں اسوقت رومن لا کے جو مدرسے جاری تھے خود بقول پروفیسر صاحب کے اسلامی فقہ اس کا کچھ اثر نہیں پڑ سکتا تھا۔ اب قابل لحاظ یہ امر ہے کہ پروفیسر صاحب نے اسلام کے جو مسائل اس دعوے کے ساتھ پیش کئے ہیں کہ وہ رومن لا کے موافق ہیں، وہ کس زمانہ کے ایجاد شدہ مسائل ہیں۔ مثلاً وراثت کے متعلق پروفیسر صاحب نے لکھا ہے کہ مسائل ذیل یعنی اولاد سلسلہ ہو رشتہ داران حقیقی خواہ آدھا خون ملا ہو یا کل اور ان کی اولاد، بیوی یا خاوند، مولائی غلام آزاد یہ سب رومن لا کے موافق ہیں۔ اس کے بعد وہ تحریر فرماتے ہیں کہ مسلمانوں میں ترکہ اس طرح تقسیم کیا جاتا تھا جو رومن لا کا طریقہ تھا یعنی کل حصے یہ تھے ۔ نصف ربع ثمن، دو ثلث، ایک ثلث، سدس، یہی حصے رومن لا میں تھے ۔ لیکن پروفیسر صاحب کو یہ معلوم نہیں کہ یہ کل حصص خود قرآن مجید میں مذکور ہیں اور قرآن مجید کی نسبت خود پروفیسر صاحب نے تسلیم کیا ہے کہ اسمیں رومی بنیاد کا پتہ نہیں لگتا البتہ ورثاء کی بعض افراد قرآن مجید میں مذکور نہیں لیکن وہ زمانۂ رسالت خلافت تک پوری طرح معین و مقرر ہو چکے تھے ۔ حدیث و آثار کی نہایت قدیم کتابیں آج موجود ہیں ان کو پڑھ کر متعصب سے متعصب شخص بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا وصیت کے متعلق پروفیسر صاحب نے فقہ کے جن مسائل کو رومن لا سے ماخوذ سمجھا ہے ان کی یہ تفصیل کی ہے ۔ وصیت تقریری ہو یا تحریری دو گواہوں کے سامنے موصی ایک ثلث جائداد سے زیادہ کی وصیت نہیں کر سکتا جبتک کہ ورثاء راضی نہ ہوں ۔ لیکن یہ مسائل بھی زمانہ نبوت یا خلافت کے مسائل ہیں اور اس امر سے ایک عام عربی داں بھی انکار نہیں کر سکتا۔

نظر اور استقصار کے ساتھ مقابلہ کیا جائے جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ جسقدر دونوں قانون میں تطابق ہے وہ توارد کی حد سے متجاوز ہے یا اسی قدر ہے جتنا کہ عموماً تمام قوموں کے قوانین بہت سی باتوں میں موافق ہوا کرتے ہیں۔ میں اول تو رومن لا سے واقف نہیں اور ہونا بھی

(بسلسلۂ حاشیہ صفحہ ۱۶۵) پروفیسر صاحب نے اور بھی مسائل گنائے ہیں جو ان کی رائے میں رومن لا سے ماخوذ ہیں ہم ان سب کی تفصیل نہیں کر سکتے۔ مختصراً اس قدر کہنا کافی ہے کہ ان میں اکثر مسائل اس زمانہ کے ہیں جن کی نسبت پروفیسر صاحب نے تسلیم کیا ہے کہ مسلمانوں نے غیر قوموں کے قوانین واحکام سے کچھ واقفیت حاصل کی تھی۔ پروفیسر صاحب کو اس بات پر بڑی حیرت ہے کہ قرآن مجید یا حدیث میں قانونی مسائل بہت کم پائے جاتے ہیں ان کی بنیاد پر اتنا بڑا دفتر فقہ کہاں سے تیار ہو گیا۔ اسی حیرت نے ان کو مجبور کیا کہ وہ فقہ اسلام کو رومن لا کا خوشہ چین بنائیں۔ لیکن پروفیسر صاحب کس کس بات پر حیرت کریں گے قانونی مسائل تو رومن لا سے ماخوذ ہیں نماز روزہ حج زکوٰۃ کے متعلق قرآن مجید و احادیث میں کون سی بڑی تفصیل ہے۔ پھر فقہ میں انھیں مسائل کا ایک عظیم الشان سلسلہ کیونکر قائم ہو گیا؟ کیا مسائل بھی رومن لا سے ماخوذ ہیں۔ اس کو بھی جانے دو۔ تمام اور اسلامی علوم کیونکر پیدا ہوئے؟ اور اس وسعت کو کیوں کر پہنچے؟ آنحضرتؐ کے زمانہ میں تفسیر، حدیث، اصول حدیث، اصول فقہ، اسماء الرجال کے کتنے مسائل ہوئے تھے اور آج ان کی کیا حالت ہے۔ کیا آج یہ سب علوم بجا گانہ فن نہیں ہیں۔ کیا ان سے مسلمانوں کی دقت نظری، تیزی طبع، وسعت خیال کا اندازہ نہیں ہوتا۔ کیا یہ علوم و فنون بھی مسلمانوں روم و یونان سے سیکھے۔ فقہ کے جن مسائل کو پروفیسر صاحب نے رومن لا سے ماخوذ بتایا ہے وہ تو اس زمانہ کے مسائل ہیں جب خود بقول پروفیسر صاحب کے مسلمانوں نے غیر قوموں سے کچھ نہیں سیکھا تھا۔ لیکن زمانہ مابعد میں بھی فقہ نے رومن لا کا کبھی احسان نہیں اٹھایا۔ پروفیسر صاحب کا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ دولت عباسیہ کے عہد ترقی میں مسلمانوں نے یونان ومصر سے علوم و فنون لئے۔ لیکن ان کو جاننا چاہیئے کہ یونان ومصر کے شاگردوں کا ایک خاص گروہ تھا۔ بے شبہ مسلمانوں میں ایسے لوگ بھی تھے جو غیر قوموں سے مستفید ہوتے تھے اور اس کو عیب نہیں سمجھتے۔ لیکن مسلمانوں ہی میں وہ گروہ بھی تھا اور وہی بہت بڑا گروہ تھا جو اپنے فضل و کمال کے زعم میں غیر قوموں کی طرف کبھی رخ بھی کرتا تھا۔ مجتہدین اور فقہاء اسی گروہ میں داخل ہیں۔ یونان اور روم وغیرہ کی کتابیں جو عربی زبان میں ترجمہ ہوئیں ان کی نہایت مفصل فہرست ہے۔ ہم کو یہ معلوم ہے کہ ان میں فلسفہ، طب، ہندسہ، نجوم، کیمیا، صنعت تاریخ، الف لیلہ ناول کی ہر قسم کی کتابیں ہیں۔ لیکن قانون کی ایک تصنیف بھی جس کی وجہ غالباً یہی ہے کہ فقہا اور مجتہدین جو اسلام میں واضع قانون تھے غیر قوموں کی خوشہ چینی کو اپنی اصطلاح میں حرام سمجھتے تھے۔ کیا امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد حنبل سے یہ امید ہو سکتی ہے کہ وہ مسائل فقہ کو جو ان کے نزدیک مذہب کا ایک حصہ تھا روم و یونان سے سیکھتے۔ اگر پروفیسر صاحب کو ان آئمہ کے حالات معلوم ہوتے اور یہ بھی معلوم ہوتا کہ فقہ کے تمام ابواب انہی بزرگوں کے عہد میں مرتب ہو گئے تھے تو وہ ہرگز ایسا دعویٰ نہ کرتے۔ البتہ یہ بات قابل لحاظ کہ بعض مسائل رومن لا اور فقہ اسلام متحد کیوں ہیں؟ لیکن اس میں فقہ اسلام کی تخصیص نہیں۔ جن قانون کا گروہ کتنے ہی بے تعلق

تو اتنی فرصت کہاں نصیب کہ تمام مسائل کا مقابلہ کر سکتا اس لئے مجھ کو اعتراف کرنا چاہیئے کہ اس موقع پر جو کچھ لکھوں گا اس کا رتبہ قیاس اور ظن سے زیادہ نہیں لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ جن لوگوں نے اس بحث کو چھیڑا ہے وہ بھی قیاس اور ظن ہی سے کام لیتے ہیں۔ کیونکہ باوجود تحقیق کے ہم کو کوئی مصنف نہیں ملا جس کا یہ دعویٰ ہو کہ وہ رومن لا اور حنفی فقہ کے تمام یا اکثر مسائل کا مقابلہ کر چکا ہے۔

اس امر سے تو انکار نہیں ہو سکتا ہے کہ فقہ حنفی میں ایسے مسائل موجود ہیں جو عرب اور عراق میں اسلام سے پہلے معمول بہ تھے۔ لیکن اس میں فقہ حنفی کی خصوصیت نہیں۔ یہ سلسلہ اور آگے چلتا ہے۔ جو مسائل آج خاص اسلام کے مسائل خیال کئے جاتے ہیں اور خود قرآن مجید میں ان کا ذکر ہے ان میں متعدد ایسے ہیں جو زمانہ جاہلیت میں معمول و متداول تھے۔ علامہ ابوہلال عسکری نے کتاب الاوائل میں ان کی تفصیل لکھی ہے۔ حضرت عمرؓ نے خراج و ٹیکس کے متعلق جو قاعدے مقرر کئے وہ عموماً وہی ہیں جو نوشیروان عادل نے اپنے زمانہ حکومت میں وضع کئے تھے اور یہ کچھ توارد نہ تھا بلکہ حضرت عمرؓ نے دانستہ نوشیروان کی اقتدا کی تھی۔ چنانچہ علامہ طبری و ابن الاثیر نے صاف انہی الفاظ میں تصریح کی ہے۔

ایک مقنن جب کسی ملک کے لئے قانون بناتا ہے تو ان تمام احکام اور رسم رواج کو سامنے رکھ لیتا ہے جو اس ملک میں اس سے پہلے جاری تھے۔ ان میں سے بعض کو وہ بعینہٖ اختیار کرتا ہے، بعض میں ترمیم و اصلاح کرتا ہے۔ بعض کی بالکل مخالفت کرتا ہے بےشبہ امام ابوحنیفہؒ بھی ایسا ہی کیا ہوگا۔ لیکن اس حیثیت سے وہ رومن لا کی نسبت ایران کے قانون سے زیادہ مستفید ہوئے ہوں گے کیونکہ اولاً تو خود فارسی النسل تھے اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۵) ہوں آپس میں مقابلہ کیا جاوے بہت مسائل مشترک ثابت ہوں گے اور قدرتاً ایسا ہونا ضرور ہے۔ جب تمام دنیا کے آدمیوں کی ذاتی تمدنی، ملکی ضرورتیں اکثر متحد اور یکساں ہیں تو ان ضرورتوں کے لحاظ سے ہر جگہ جو قوانین وضع کئے جاویں گے ان کے مسائل کا مشترک ہونا کون سے تعجب کی بات ہے۔ شعر دو راہ رو۔
کہ بیک رہ روند در یک سمت ۞ عجب نہ باشد گر او فتند پے بر پے۔ ۱۲

ان کی زبان مادری فارسی تھی۔ دوسرے ان کا وطن کوفہ اور وہ فارس کے اعمال میں داخل تھا۔

غرض یہ امر بہرحال قابل تسلیم ہے کہ امام صاحب کو فقہ کی توضیح میں ان قواعد اور رسم و رواج سے ضرور مدد ملی ہو گی جو ان ممالک میں جاری تھے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ایسی استعانت سے امام صاحب کے واضع قانون ہونے کی حیثیت پر کیا اثر پڑتا ہے یعنی وہ ایک مستقل واضع قانون کہے جا سکتے ہیں یا صرف ناقل اور جامع۔ جہاں تک ہماری تحقیق ہے مسلمانوں نے غیر قوموں کی قانونی تصنیفات سے بہت کم واقفیت کی۔ ترجموں کی فہرست میں ہم سینکڑوں ہزاروں کتابوں کے نام پاتے ہیں لیکن وہ فلسفہ طب وغیرہ کی تصنیفات ہیں۔ قانون کی ایک کتاب کا بھی پتہ نہیں چلتا جو عربی زبان میں ترجمہ کی گئی ہو۔ اور اس قدر قطعاً ثابت ہے کہ امام صاحب نے جس زمانہ میں فقہ کی تدوین کی کسی ایسی کتاب کا ترجمہ نہیں ہوا تھا۔ اس لئے یہ احتمال کہ امام ابو حنیفہ رح نے غیر قوموں کی قانونی تصنیفات سے فائدہ اٹھایا ہو بالکل بے اصل ہے ملک میں رسم و رواج کی بنیاد پر جو احکام نافذ تھے اس قابل نہ تھے کہ بغیر تحریر میں آ کر قانون کا لقب حاصل کر سکتے۔"

مختصر یہ کہ جس قدر تاریخی قرآئن موجود ہیں ان سے ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ امام صاحب کو روم یا فارس کی کوئی قانونی تصنیف ہاتھ آئی جس کے نمونہ پر انھوں نے فقہ کی بنیاد رکھی۔ اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ امام ابو حنیفہ رح سے پہلے فقہ کے مسائل جس قدر اور جس صورت میں مدون ہو چکے تھے وہ فن کی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ ان باتوں کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ اگر فقہ کو ایک قانون مانا جائے تو ضرور ماننا پڑے گا کہ امام صاحب ہی اس کے مقنن اور واضع تھے۔ البتہ ان کو ملک کے رسم و رواج مسائل معمول بہا، علماء کے فتوے سے مدد ملی۔ لیکن یہ اسی قسم کی مدد ہے جس سے دنیا کے اور واضعان قانون بھی بے نیاز نہ تھے۔ اس لئے یہ امر امام صاحب کی مقننیت کے رتبہ کو گھٹا نہیں سکتا۔

ان عام مباحث کے بعد اب ہم ان خاصیتوں[1] کا ذکر کرتے ہیں جن کی وجہ سے حنفی فقہ کو اور فقہوں کے مقابلہ میں ترجیح حاصل ہے:۔

(۱) سب سے مقدم اور قابل قدر خصوصیت جو فقہ حنفی کو حاصل ہے وہ مسائل کا اسرار و مصالح پر مبنی ہوتا ہے۔ احکام شرع کے متعلق اسلام میں شروع ہی سے دو فرقے قائم ہو گئے۔ ایک گروہ کی یہ رائے ہے کہ یہ احکام تعبدی احکام ہیں۔ یعنی ان میں کوئی سر اور مصلحت نہیں ہے۔ مثلاً شراب خوری یا فسق و فجور صرف اس لئے ناپسندیدہ ہیں کہ شریعت نے ان سے منع کیا ہے۔ اور خیرات و زکوٰۃ صرف اس لئے مستحسن ہیں کہ شارع نے ان کی تاکید کی ہے ورنہ فی نفسہ یہ افعال برے یا بھلے نہیں ہیں۔ امام شافعی کا اسی طرف میلان پایا جاتا ہے اور شاید اسی کا اثر تھا کہ ابوالحسن اشعری نے جو شافعیوں میں علم کلام کے بانی ہیں علم کلام کی بنیاد اسی مسئلہ پر رکھی۔

دوسرے فرقہ کا یہ مذہب کہ شریعت کے تمام احکام مصالح پر مبنی ہیں۔ البتہ بعض مسائل ایسے بھی ہیں جن کی مصلحت عام لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ لیکن درحقیقت وہ مصلحت سے خالی نہیں۔ یہ مسئلہ اگرچہ بوجہ اس کے کہ اس کے دونوں پہلو بڑے بڑے علماء نے اختیار کئے ہیں ایک معرکۃ الآراء مسئلہ بن گیا ہے۔ لیکن انصاف یہ ہے کہ وہ اس قدر بحث و اختلاف کے قابل نہ تھا۔ تمام مہمات مسائل کی مصلحت اور غایت خود کلام الٰہی میں مذکور ہے۔ کفار کے مقابلہ میں قرآن کا طرز استدلال عموماً اسی اصول کے مطابق ہے۔ نماز کی مصلحت خدا نے خود بتائی کہ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ۔ روزہ کی فرضیت کے ساتھ ارشاد ہوا لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۔ جہاد کی نسبت فرمایا لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ۔ اسی طرح اور احکام کے متعلق قرآن و حدیث میں جابجا تصریحیں اور ارشاد موجود ہیں کہ ان کی غرض و غایت کیا ہے۔ (امام ابو حنیفہ کا یہی

---

[1] یاد رکھنا چاہئے کہ جن خصوصیتوں کا ہم نے دعویٰ کیا ہے وہ بلحاظ اکثر مسائل کے ہے ممکن ہے کہ بعض جزئیات کے لحاظ سے یہ خصوصیات امام صاحب کے مذہب میں نہ پائی جائیں اور دوسرے اماموں کی فقہ میں پائی جائیں لیکن ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ امام صاحب کے اکثر مسائل میں یہ خصوصیتیں پائی جاتی اور اماموں کے اکثر مسائل میں نہیں پائی جاتیں۔

مذہب تھا اور یہ اصول ان مسائل فقہ میں عموماً مرعی ہے۔ اسی کا اثر ہے کہ حنفی فقہ جس قدر اصول عقلی کے مطابق ہے اور کوئی فقہ نہیں۔ امام طحاوی نے جو محدث اور مجتہد دونوں تھے اس بحث میں ایک کتاب لکھی ہے جو "شرح معانی الآثار" کے نام سے مشہور ہے جس کا موضوع یہ ہے کہ مسائل فقہ کو نصوص و طریق نظر سے ثابت کیا جائے۔ محدث مذکور نے فقہ کے ہر باب کو لیا ہے اور اگرچہ انصاف پرستی کے ساتھ بعض مسئلوں میں امام ابوحنیفہ سے مخالفت کی ہے۔ لیکن اکثر مسائل کی نسبت مجتہدانہ طرز استدلال سے ثابت کیا ہے کہ امام ابوحنیفہ کا مذہب احادیث اور طریق نظر دونوں کے موافق ہے امام محمد نے بھی کتاب الحج میں اکثر مسائل میں عقلی وجوہ سے استدلال کیا ہے۔ یہ دونوں کتابیں چھپ گئی ہیں اور ہر جگہ ملتی ہیں جس کو تفصیل مقصود ہو ان کتابوں کی طرف رجوع کرے۔ اس دعوے سے امام ابوحنیفہ کا مذہب عقل کے موافق ہے۔ شافعیہ وغیرہ کو بھی انکار نہیں اور وہ انکار کیوں کرتے۔ ان کے نزدیک احکام شرعیہ خصوصاً عبادات جس قدر عقل سے بعید ہوں اسی قدر ان کی خوبی ہے۔

امام رازی نے زکوٰۃ کی بحث میں لکھا ہے کہ "امام شافعی کا مذہب امام ابوحنیفہ سے زیادہ صحیح ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ امام شافعی کا مذہب عقل و قیاس سے بعید ہے اور یہی صحت کی دلیل ہے کیونکہ زکوٰۃ کے مسائل زیادہ تر تعبدی احکام ہیں۔ جن میں عقل و رائے کو دخل نہیں۔"

بخلاف اور ہمعصروں کے امام ابوحنیفہ کا اس اصول کی طرف مائل ہونا ایک خاص سبب تھا۔ دوسرے ائمہ جنہوں نے فقہ کی تدوین و ترتیب کی ان کی علمی ابتدا فقہی مسائل سے ہوئی تھی۔ بخلاف اس کے امام ابوحنیفہ کی تحصیل علم کلام سے شروع ہوئی جس کی ممارست نے ان کی قوت فکر اور جدت نظر کو نہایت قوی کر دیا تھا۔ معتزلہ وغیرہ جن سے ان کے معرکے رہتے تھے عقلی اصول کے پابند تھے اس لئے امام صاحب کو ان کے مقابلہ میں انہیں اصول سے کام لینا پڑا تھا اور متنازع فیہ مسائل میں مصالح و اسرار کی خصوصیتیں دکھائی پڑتی تھیں اس غور و تدقیق، مشق و مہارت سے ان کو ثابت

ہو گیا تھا کہ شریعت کا ہر مسئلہ اصول عقل کے مطابق ہے۔ علم کلام کے بعد وہ فقہ کی طرف متوجہ ہوئے تو ان مسائل میں بھی وہ جستجو رہی۔ حنفی فقہ کے مسائل کا دوسرے فقیہوں کے مسائل سے مقابلہ کیا جائے تو یہ تفاوت صاف نظر آتا ہے۔ معاملات تو معاملات عبادات میں بھی جسکی نسبت ظاہر بینوں کا خیال ہے کہ اس میں عقل کو دخل نہیں امام صاحب کے مسائل عموماً عقل کے موافق ہوتے ہیں۔

اگر اس بات پر غور کیا جائے کہ نماز روزہ حج زکوٰۃ شریعت میں کن مصلحتوں سے فرض کئے گئے ہیں اور ان مصالح کے لحاظ سے ان احکام کی بجا آوری کا کیا طریقہ ہونا چاہیئے تو وہی طریقہ موزوں ثابت ہو گا جو حنفی فقہ سے ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً نماز چند افعال کے مجموعہ کا نام ہے۔ لیکن اس لحاظ کہ نماز نام کی اصل غرض کیا ہے (یعنی خضوع، اظہار تعبد، اقرار عظمت الٰہی، دعا) اور اس کے حاصل ہونے میں کن کن افعال کو کس نسبت سے دخل ہے؟ ان افعال کے مراتب مختلف ہیں۔ بعض لازمی اور ضروری ہیں کیونکہ ان کے نہ ہونے سے نماز کی اصل غرض فوت ہوتی ہے۔ ان افعال کو شریعت کی زبان میں فرض سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بعض افعال ایسے ہیں جو طریقۂ ادا میں ایک حسن و خوبی پیدا کرتے ہیں۔ لیکن ان کے فوت ہونے سے اصل غرض فوت نہیں ہوتی ان افعال کا رتبہ پہلی قسم سے کم ہے اور ان کو سنّت و مستحب سے تعبیر کرتے ہیں۔

اوپر ہم لکھ آئے ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے خود فرض واجب و سنت کی کوئی تصریح نہیں فرمائی۔ لیکن اس میں کچھ شبہ نہیں ہو سکتا تھا کہ نماز کے تمام افعال یکساں درجہ نہیں رکھتے تھے۔ اس لئے تمام مجتہدین نے ان کے امتیاز مراتب پر توجہ کی اور استنباط اجتہاد کی رو سے ان افعال کے مختلف مدارج قائم کئے اور ان کے جدا جدا نام رکھے امام ابو حنیفہ رح نے بھی ایسا ہی کیا۔ لیکن اس باب میں ان کو اور ائمہ پر جو ترجیح ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے جس افعال کو جس رتبہ پر رکھا درحقیقت ان کا وہی رتبہ تھا۔ مثلاً سب سے ضروری یہ امر ہے کہ نماز کے ارکان یعنی وہ افعال جن کے بغیر نماز ہو ہی نہیں سکتی کیا ہیں؟ چونکہ نماز اصل میں اقرار عبودیت اور اظہار خشوع کا نام ہے اس لئے ایسی

قدر تو سب مجتہدین کے نزدیک مسلّم رہا کہ نیت، تکبیر، قرأت، رکوع، سجود وغیرہ جن سے بڑھ کر اقرارِ عبودیت اور اظہارِ خشوع کا کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا، فرض اور لازمی ہیں اور خود شارع الٰہ نے ان کے لازمی اور ضروری ہونے کی طرف اشارے کئے بلکہ بعض جگہ تصریح بھی کی۔ لیکن اور ائمہ نے یہ زیادتی کی کہ ان کے ارکان کی خصوصیتوں کو بھی فرض قرار دے دیا حالانکہ خصوصیتیں لازم نہ تھیں۔ اس لئے امام ابوحنیفہ ان کی فرضیت کے قائل نہیں۔ مثلاً امام ابوحنیفہ کے نزدیک تکبیر تحریمہ اللہ اکبر کے سوا اور الفاظ سے بھی ادا ہو سکتی ہے جو اس کے ہم معنی ہیں (مثلاً اللہ اعظم، اللہ اجلّ) امام شافعی کے نزدیک اس سے نماز باطل ہو جاتی ہے۔ امام ابوحنیفہ رح کے نزدیک تکبیر اگر فارسی زبان میں کہی جائے تب بھی جائز ہے۔ امام شافعی کے نزدیک اس سے نماز باطل ہو جاتی ہے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک قرآن مجید کی کسی آیت کے پڑھنے سے قرأت فرض ادا ہو جاتا ہے۔ امام شافعی کے نزدیک بغیر سورۃ فاتحہ کے نماز ہو ہی نہیں سکتی۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک جو شخص عربی میں قرآن پڑھنے سے معذور ہے وہ مجبوراً ترجمہ پڑھ سکتا ہے[1]۔ امام شافعی کے نزدیک کسی حالت میں نماز نہیں ہو سکتی۔

اس سے یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ امام ابوحنیفہ یا کسی مجتہد نے عقل وقیاس سے نماز کے ارکان متعین کئے ہیں۔ ائمہ نے ان ارکان کے ثبوت کے لئے عموماً احادیث کی تصریحات و ارشادات سے استدلال کیا ہے چنانچہ ہر مجتہد کے نقلی دلائل کتب فقہ میں بتفصیل مذکور ہیں۔ ہمارا مطلب یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ کے دعووں پر جس طرح نقلی دلائل یعنی احادیث کی تصریحیں اور ارشادات موجود ہیں اسی طرح عقلی وجوہ بھی ان کی صحت کے شاہد ہیں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام صاحب شریعت کے اسرار و مصالح کو نہایت دقیق نگاہ سے دیکھتے تھے۔

---

[1] امام محمد نے جو جامع صغیر میں جو روایت کی اس مجبوری کی قید نہیں ہے اور اسی بنا پر مخالفین امام صاحب پر یہ سخت اعتراض کیا ہے کہ وہ قرآن کی حقیقت یا مفہوم میں الفاظ کو دخل نہیں سمجھتے یعنی انکے نزدیک صرف قرآن کے معانی پر قرآن کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ بےشبہ امام صاحب کی اس غلطی کو ہم تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن فقہ حنفیہ نے دعویٰ کیا ہے امام صاحب نے بالآخر اس قول سے رجوع کیا ہے۔ ۱۲

زکوٰۃ کے مسائل کا بھی یہی حال ہے۔ زکوٰۃ کا اصلی مقصد بنی نوع کی ہمدردی اور اعانت ہے اس لئے زکوٰۃ کے مصرف میں وہ لوگ خاص کر دیے گئے ہیں جو سب سے زیادہ ہمدردی اور اعانت کا استحقاق رکھتے ہیں۔ یعنی فقراء، مساکین، عمال زکوٰۃ، مؤلفۃ القلوب، مقروض، مسافر، غازی، مکاتب۔ چونکہ ان لوگوں کی تصریح خود قرآن مجید میں مذکور ہے اسی لئے اس امر میں سب مجتہدین کا اتفاق رہا کہ یہ لوگ مصرف زکوٰۃ ہیں۔ لیکن تعیین نے ایک اختلاف پیدا کر دیا۔ امام شافعی نے ان اقسام کے ذکر سے یہ خیال کیا کہ یہ سب اشخاص زکوٰۃ کے ادا میں لازمی ہیں یعنی جب تک ان آٹھوں اقسام کے لوگوں کو زکوٰۃ نہ ادا کی جائے فرض ادا ہی نہیں ہو سکتا۔ بخلاف اس کے امام ابوحنیفہ کا یہ مذہب ہے کہ زکوٰۃ ان اقسام سے باہر نہ جانے پائے۔ باقی یہ امر کہ ان لوگوں میں سے سب کو دی جائے یا بعض کو؟ یہ امر مقتضائے وقت اور ضرورت پر موقوف ہے۔ امام اور حاکم وقت ضرورت کے لحاظ سے جس کو چاہے انتخاب کر سکتا ہے۔

ایک اور مسئلہ جس میں امام ابوحنیفہ دوسرے ائمہ سے مختلف ہیں وہ یہ کہ چارپایوں کی زکوٰۃ ادا کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ امام ابوحنیفہ کے نزدیک زکوٰۃ میں جانور یا اس کی قیمت ادا کی جا سکتی ہے۔

امام شافعی کے نزدیک قیمت ادا کرنے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی حالانکہ زکوٰۃ کی غرض حاصل ہونے میں جانور اور اس کی قیمت دونوں برابر ہیں۔ اس لئے شارع نے بھی کوئی تخصیص نہیں فرمائی۔

ان مسائل کے سوا عبادات کے سینکڑوں مسائل ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ حنفی مسائل میں ہر جگہ مصالح اور اسرار کی خصوصیت ملحوظ ہے لیکن ہم تطویل کے خوف سے ان سب کی تفصیل نہیں کر سکتے۔ معاملات کے مسائل میں یہ عقیدہ زیادہ حل ہو جاتا ہے اور صاف نظر آتا ہے کہ امام ابوحنیفہ کا مذہب کس قدر مصالح اور اسرار کے موافق ہے۔

(۲) دوسری خصوصیت یہ ہے کہ فقہ حنفی بہ نسبت تمام اور فقہوں کے نہایت
اور یسیر التعمیل ہے۔ قرآن میں متعدد جگہ آیا ہے کہ "خدا تم لوگوں کے ساتھ آسا
چاہتا ہے سختی نہیں چاہتا"۔ رسول اللہؐ کا قول ہے کہ "میں نرم اور آسا
شریعت لے کر آیا ہوں"۔ بے شبہ اسلام کو اور مذہبوں کے مقابلہ میں یہ فخر
ہے کہ وہ رہبانیت سے نہایت بعید ہے۔ اس میں عبادات شاقہ نہیں ہیں
کے مسائل آسان اور یسیر التعمیل ہیں۔ حنفی فقہ کو بھی اور فقہوں پر ترجیح
ہے۔

حنفی فقہ کا آسان اور وسیع ہونا ایسا متعارف ہے کہ شعراء اور مصنف
اس کو ضرب المثل کے طور پر ذکر کرتے ہیں۔ انوری نے جو ایک نحاش اور بد
شاعر تھا اگرچہ بڑے موقع پر اس کا استعمال کیا اور کہا ع چوں رخصتہائے بوحنیفہ
تاہم اصل مدعا کا ثبوت اس سے بھی ہوتا ہے۔ عبادات اور معاملات کا کوئی
کوئی فصل لے لو یہ تفرقہ صاف نظر آتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے مسائل ا
اور نرم ہیں جو شریعت سہلہ کی شان ہے۔ بخلاف اس کے اور ائمہ کے
سے احکام نہایت سخت اور عسیر التعمیل ہیں۔ مثلاً کتاب الجنایات و کتا
الحدود کے مسائل۔ انہی میں سرقہ کے احکام ہیں۔ چنانچہ ہم اس کے
جزئیات نمونہ کے طور پر یہاں لکھتے ہیں۔

اس قدر تو سب کے نزدیک مسلم ہے کہ سرقہ کی سزا قطع ید یعنی ہاتھ
ہے لیکن مجتہدین نے سرقہ کی تعریف میں چند شرطیں اور قیود
ہیں جن کے بغیر قطع ید کی سزا نہیں ہو سکتی۔ ان شروط کے لحاظ سے
جو اثر پڑتا ہے وہ ذیل کی جزئیات سے معلوم ہوگا جس سے یہ بھی معلوم
ہوگا کہ امام ابوحنیفہؒ کا مذہب کس قدر آسان ہے اور تمدن ا
کے کس قدر موافق ہے۔